نورشاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی

مقالہ برائے

ماسٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار

غلام مرتضیٰ

رجسٹریشن نمبر: 20HUHL02

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد، تلنگانہ۔ ۵۰۰۰۴۶

۲۰۲۲ء

نور شاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی

مقالہ برائے

ماسٹر آف فلاسفی (اردو)

مقالہ نگار

غلام مرتضیٰ

رجسٹریشن نمبر:20HUHL02

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

شعبۂ اردو

اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد، تلنگانہ۔ ۵۰۰۰۴۶

۲۰۲۲ء

فہرست

پیش لفظ: 03

باب اول: 06

نورشاہ کی حیات اورادبی خدمات

(الف) حالات زندگی

(ب) ادبی خدمات

باب دوم: 27

کشمیر کا تہذیبی، تاریخی وادبی منظرنامہ

باب سوم: 58

نورشاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی

حاصل مطالعہ 97

کتابیات: 104

پیش لفظ

پیش لفظ

جموں کشمیر ابتداء ہی سے شعر وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ملک کے اس خوبصورت خطے میں مقامی زبانوں کے علاوہ اردو زبان کو اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں اردو شعراء و ادباء کی ایک کثیر تعداد دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان شعراء و ادباء نے تمام شعری و نثری ادبی اصناف میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ جس صنف نے یہاں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی وہ صنف افسانہ ہے۔ افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، جن میں ایک نام نور شاہ کا بھی ہے۔ نور شاہ کا شمار جموں و کشمیر کے معروف فنکاروں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے افسانوں کے علاوہ، ناولٹ، ناول اور ڈرامے میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں غریب اور نادار طبقے کے تئیں محبت و ہمدردی ملتی ہے وہیں ظالم و جابر طبقے کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانوی فضا بھی ملتی ہے اور جنسی بے راہ روی بھی۔ اس کے علاوہ سماجی نابرابری، لالچ و ہوس پرستی اور افلاس و تنگ دستی جیسے مسائل ملتے ہیں۔

نور شاہ کشمیر کے قدرتی مناظر کی آغوش میں پلے بڑھے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانوں میں کشمیری سماج، وہاں کے قدرتی مناظر اور وہاں کی تہذیب کی بڑی فنکارانہ انداز میں منظر کشی ملتی ہے۔ اس مقالے میں نور شاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کو دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ افسانے سے دلچسپی کے سبب میں نے اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کے مشورے سے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ جسے شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے صدرِ شعبہ اور دیگر اساتذہ صاحبان نے بھی منظور کیا اور میرے مقالے کا عنوان ''نور شاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی'' طے پایا۔

راقم نے اپنے نگراں کی تجاویز اور مشوروں کے بعد اپنے اس ایم۔فل کے مقالے کو تین ابواب

میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب ''نورشاہ کی حیات وادبی خدمات'' ہے۔اس باب میں نورشاہ کے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔مقالے کا دوسرا باب ''کشمیر کا تہذیبی،تاریخی وادبی منظرنامہ'' کے عنوان سے ہے۔جس میں کشمیر کی تہذیب وثقافت اور وہاں کے رسم ورواج کا مختصراً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کا تیسرا اور آخری باب ''نورشاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے، جو اس مقالے کا بنیادی اور اہم باب ہے۔اسی باب کے عنوان پر مقالے کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔اس میں نورشاہ کے ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے جن میں کشمیری تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔مقالے کے آخر میں ماحصل جس میں پورے مقالے کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور آخر میں کتابیات درج ہے جو حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کی گئی ہے۔

موضوع کے متعلق مواد کی تلاش راقم نے انتخابِ موضوع کے فوراً بعد شروع کی۔نورشاہ کی کتابیں کشمیر کے مختلف کتب خانوں سے حاصل ہوئیں۔کچھ کتابیں جموں یونیورسٹی سے بھی ملیں۔مواد اکٹھا کرتے وقت جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی اور میزان پبلشرز سے بھی استفادہ کیا گیا۔

میں اپنی نگراں محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبیں صاحبہ کا بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے انتخابِ موضوع سے مقالے کی تکمیل تک قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور مفید وکارآمد مشوروں سے نوازتی رہیں۔انہوں نے مقالے کے ایک ایک لفظ کو پڑھا اور حسبِ ضرورت زبان کی نوک پلک درست کرنے کا جو کام کیا اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں صدرِ شعبہ محترم پروفیسر سیّد فضل اللہ مکرم صاحب اور شعبہ کے باقی اساتذہ صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کورس ورک کے دوران مجھے تحقیق کے اصولوں اور باریکیوں سے روشناس کرایا۔

میں اپنے والدین کا بے حد سپاس گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور ہمیشہ

میری کامرانی کے لئے دعائیں کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ماضی کے حالات اور تہذیب سے جُڑے قصے کہانیاں سناتے رہے ہیں، جن سے فکشن کی طرف میری دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان کے علاوہ اپنے بھائی غلام مصطفٰے کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری رہبری فرمائی۔ آخر کار اپنی بہنوں کا بھی شکریہ ادا کرنا کیسے بھول سکتا ہوں جو مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں سے نوازتی رہی ہیں۔

میں اپنے دوست محمد اسد، انظر نبی ڈار، جاوید یوسف، خالد محمود، عبدالرّزاق، قمر مغل، جاوید اقبال، اعجاز احمد، عرفان وزیر، بلال احمد ڈار، اشفاق احمد آہنگر، لال محمد، محمد یاسر اور عرفان احمد ڈار کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور تحقیق کے دوران میری مدد کے لئے پیش پیش رہے۔

خصوصاً میں اپنے دوست اور اس مقالے کے کمپوزر جان محمد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس کے سبب یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

غلام مرتضٰی

ایم اے۔ اردو

باب اوّل

نور شاہ کی حیات اور ادبی خدمات

(الف) حالات زندگی

آباواجداد

نورشاہ اردو ادب کے ایک اہم ستون ہیں جو نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی افسانہ نگاری کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔نورشاہ ریاست جموں کشمیر کے صوبہ کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔اُن کے جدامجد سرینگر کے رہنے والے تھے۔نورشاہ کے دادا کا نام غلام محمد شاہ تھا جو پیشے سے ایک تاجر تھے اور تجارت ہی اُن کا معاشی ذریعہ تھا۔نورشاہ کے والد کا نام غلام نبی شاہ اور والدہ ماجدہ کا نام مرحومہ شاہ بیگم تھا۔نورشاہ کے والد نے بھی اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تجارت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

نورشاہ کے والد نے بھی تجارت میں کافی نام کمایا اور پچاس سال تک وہ اس پیشے سے منسلک رہے اور آخر کار ہمیشہ کے لئے داعی اجل کو لبیک کہہ کر محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔غلام نبی شاہ کے ہاں چار بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں بڑے بیٹے کا نام نورشاہ تھا۔نورشاہ کے تین بھائیوں کا نام محی الدین، شاہ بشیر شاہ اور ڈاکٹر حسین شاہ ہے اور بہنوں کا نام حسینہ بٹ اور نعیمہ قیوم ہے۔نورشاہ تمام بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اس لئے گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آ گئیں۔اپنے گھر میں انھوں نے بڑا بیٹا ہونے کا فرض بخوبی انجام دیا۔نورشاہ نے اپنے بھائی بہنوں کی تعلیم و تربیت میں اپنا مثالی کردار ادا کیا۔اُنہوں نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کو وہ تمام سہولیات فراہم کیں جو کہ ایک طالب علم کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

سرینگر ہی نورشاہ کا آبائی وطن رہا۔نورشاہ کے جدامجد شروع ہی سے سرینگر میں مقیم تھے۔نورشاہ کا اصلی نام نور محمد شاہ ہے اور قلمی نام انھوں نے نورشاہ اختیار کیا اور ادبی دنیا میں اسی نام سے مشہور

ہوئے۔

پیدائش

نورشاہ کی پیدائش سرینگر میں جھیل ڈل سے متصل ڈل گیٹ کے محلّہ درگجن میں ۹ جولائی ۱۹۳۶ء میں ایک علمی وتاجر گھرانے میں ہوئی۔کشمیر کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے اردواور فارسی کے مشہور شاعر حضرت امیر خسرو نے کہا تھا:

اگر فردوس بروے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس خوبصورت وادی میں نورشاہ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت

بچپن ہی سے نورشاہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اوران کا گھرانہ بھی ایسا ہی تھا جس میں کافی حضرات علم شناس تھے۔لہٰذااس اعتبار سے نورشاہ کوتعلیم حاصل کرنے کا اچھاماحول میسر ہوا۔نورشاہ کو والدکی بہ نسبت والدہ نے تعلیم کی طرف زیادہ راغب کیا۔ان کی والدہ نے ہروہ چیزاُن کومہیا کی جس سے ان کی تعلیم میں اعلیٰ نکھار پیدا ہوسکتا تھا۔نورشاہ بچپن ہی سے ادب کا مطالعہ کرتے تھے۔اوروہ بڑے ذوق وشوق اورلگن سے پڑھتے تھے۔

نورشاہ نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ مڈل اسکول درگجن سرینگر سے حاصل کی اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر کا رُخ کیا۔اسلامیہ ہائی اسکول سے نورشاہ نے دسویں جماعت کا امتحان ۱۹۴۵ء میں پاس کیا۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نورشاہ نے سرینگر امرسنگھ کالج میں داخلہ لیا۔جہاں سے انہوں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔اس دوران ان کو بہت ہی شفیق اساتذہ ملے،جنہوں نے قدم قدم پران کی رہنمائی کی اوران کے ذہن کووسعت بخشی۔شروع ہی سے نورشاہ کوعلم وادب سے رغبت رہی۔کتابوں کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے۔اکثر وہ

داستان، ناول، افسانہ اور کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور بڑی باریک بینی سے اُن کا جائزہ لیتے تھے۔

نور شاہ کے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا اُن کے گھر میں روزانہ اخبار آتا تھا اور اُن کی والدہ اُن کو پاس بٹھا کر اُن سے اخبار پڑھاتی تھی۔ اور اس کے بعد اس بات پر بھی اُن کو سختی سے عمل بجالانے کے لئے مجبور کرتی تھیں کہ روز اخبار کی سرخیاں اپنے اسکول میں جا کر مارننگ اسمبلی میں پیش کریں۔ نور شاہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ اس اخبار کی روزانہ مشق سے مجھ میں اردو کے تیئں بہت محبت پیدا ہوگئی اور میں روز کچھ نہ کچھ الفاظ اردو کے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا تھا جس سے مجھے اردو بولنے اور لکھنے میں کافی مدد ملتی تھی۔

جس کی وجہ سے انہوں نے ریاست کے سب سے بڑے امتحان (کے اے ایس) میں کامیابی حاصل کی۔

نور شاہ کی زندگی کا یہ بہت ہی پُر مسرت لمحہ تھا کہ جب انہوں نے ریاست کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اپنی ریاضت و محنت سے یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر کر دکھایا۔

ملازمت

ریاست کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی ملنے کے بعد ریاست کے مختلف محکموں میں نور شاہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور عوام کی خدمات انجام دیتے رہے۔ نور شاہ نے گھریلو مجبوریوں کے باعث پڑھائی سے زیادہ ملازمت کو ترجیح دی تا کہ گھر کے اخراجات با آسانی چلائے جاسکیں۔ کیونکہ والد ہمیشہ بیمار رہتے تھے اور بھائی بہن بھی چھوٹے تھے۔

مشیرِ تعلیم سے نور شاہ نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور ملازمت کے دوران نور شاہ جن جن عہدوں پر فائز رہے اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ ڈپٹی کمشنر سینٹرل محکمہ دیہی ترقی

۲۔ فیلڈ پبلک سیٹی آفیسر جموں کشمیر

۳۔ ڈائریکٹر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ (جموں کشمیر)

۴۔ چیف اگزیکیٹیو آفیسر جموں کشمیر انرجی ڈولپمنٹ اجنسی (جموں کشمیر)

ان تمام تر عہدوں پر کام کرنے کے بعد اور اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دینے کے بعد تیس ۳۰ جون ۱۹۹۴ء کو نور شاہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے دوران بھی نور شاہ بہت سارے رسالوں کے مدیر رہے ہیں۔جن میں ماہنامہ ''دیہات'' اہمیت کا حامل اخبار ہے۔اوراس کے علاوہ پاپولر سائنس اور سائنس نیوز کی ذمہ داریاں بھی بحثیت کوارڈینیٹر انجام دیتے رہے۔

ازدواجی زندگی

نور شاہ گھر میں تمام بھائی بہنوں سے بڑے تھے۔اس لئے گھر کے تمام اخراجات اُن کو اُٹھانے پڑتے تھے۔نور شاہ نے ریاست کا سب سے بڑا امتحان پاس کرنے کے بعد ہی شادی کی۔شادی کے وقت نور شاہ کی عمر ستائیس سال تھی۔نور شاہ نے شادی سرینگر سے کی تھی۔سرینگر کے ایک مشہور گھرانے میں اُن کی شادی ایک نیک سیرت خاتون سے ہوئی۔

نور شاہ کی بیگم کا نام شہزادی شاہ تھا۔وہ ایک نیک سیرت اور دیندار خاتون تھیں۔اگرچہ انہوں نے دنیاوی تعلیم زیادہ حاصل نہیں کی،صرف دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی مگر پھر بھی وہ علمی جہتوں سے بخوبی واقف تھیں۔نور شاہ نے شادی اپنی پسند سے کی تھی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی سے پوری طرح مطمئن نظر آتے ہیں۔

نور شاہ کی بیگم نہایت ہی شریف النفس اور بیدار مغز خاتون تھیں۔کشمیر کی مہمانوازی تو ساری دنیا میں مشہور ہے نور شاہ کی اہلیہ بھی مہمانوں کی بہت زیادہ قدر کرتی تھیں۔اور گھر میں آئے مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں غرض وہ کشمیری تہذیب کی پوری طرح پاسداری کرتی تھیں۔ نور شاہ کی بیگم شہزادی شاہ کا انتقال ۲۳ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو سرینگر میں ہوا۔

اولادیں

نورشاہ کی تین اولادیں ہیں جن میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹے کا نام ندیم نور اور بیٹیوں کے نام نگہت اور سمی ہیں۔نورشاہ کا بیٹا اور بیٹیاں تینوں شادی شدہ ہیں۔نورشاہ کی بڑی بیٹی کی شادی سرینگر ہی میں ہوئی ہے اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ سرینگر میں رہائش پذیر ہیں۔نورشاہ کی چھوٹی بیٹی سمی اپنے خاوند کے ساتھ قطر میں مقیم ہیں۔

نورشاہ کے بیٹے ندیم نور نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور دورانِ تجارت انہوں نے دبئی (Dubai) اور قطر (Qatar) کا سفر بھی کیا۔ندیم نور کی شادی بھی سرینگر کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ان کی شریک حیات کا نام شفق غنی ہے۔شفق غنّی کے بطن سے انھیں تین اولادیں ہیں اور وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت خوش ہیں۔

نورشاہ کے ادبی سفر میں ان کی بیوی اور اُن کی اولاد نے کلیدی کردار ادا کیا ہے اور قدم قدم پر اُن کا ساتھ دیا ہے۔نورشاہ نے انہیں ہر مشکل گھڑی میں ثابت قدم پایا۔اس وقت بھی نورشاہ راول پورہ سرینگر میں رہائش پذیر ہیں اور اپنی زندگی کے ایام بہت ہی پُرمسرت طریقے سے بسر کر رہے ہیں۔

وضع قطع اور لباس

نورشاہ پروقار اور جامہ زیب شخصیت کے مالک ہیں۔وہ ایک نرم دل اور ملنسار انسان ہیں ان کا حلیہ کچھ اس طرح سے ہے۔طبیعت ایسی خوش مزاج ہے کہ نا تو وہ خود کبھی رنجیدہ ہوتے ہیں اور نا ہی اپنے ذات سے کسی دوسرے کو رنجیدہ ہونے دیتے ہیں۔ان کا دل ہمیشہ کشادہ رہتا ہے دوسروں کی حمایت میں ہمیشہ بولتے ہیں اور سچائی کا ساتھ دیتے ہیں۔کبھی بھی کسی بھی وجہ کو لے کر اُن کے ماتھے پر کوئی بل یا شکن کبھی نمودار نہیں ہوتا اور یہی ایک سچے اور مخلص انسان کی پہچان ہوتی ہے۔

محبت اور اخلاق اُن کی شخصیت کا خاصا ہے مہمان نوازی میں بھی اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا وہ

گھر آئے مہمان کی بڑی خاطر داری کرتے ہیں اور خالی ہاتھ کسی کو بھی اپنے دولت خانے سے نہیں لوٹاتے۔ سیاست میں اُن کو بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔ تعصب اور بغض جیسی بُری خصلت سے وہ بالکل پاک ہیں۔ مذہبی تعصب سے بھی پاک ہیں اور سماجی نابرابری کے بالکل خلاف ہیں۔

نورشاہ پینٹ شرٹ زیب تن کرتے ہیں اور کبھی کبھی شلوار قمیض بھی پہنتے ہیں۔ دیکھنے میں دبلے پتلے انسان نظر آتے ہیں۔ قد کے لمبے ہیں اور رنگ سے گورے نظر آتے ہیں۔ داڑھی چھوٹی رکھتے ہیں۔ سر پر ٹوپی پہنتے ہیں اور سردیوں میں پھرن پہنتے ہیں۔ لذیز قسم کے کھانے کھاتے ہیں جن میں رشتہ، کباب، روغن جوش، یخنی اور تبک ماز وغیرہ شامل ہیں۔ کشمیری چائے کے بہت شوقین ہیں۔ چائے کے ساتھ کشمیری روٹی (ژگردہ) بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

☆☆☆

(ب) نور شاہ کی ادبی خدمات

نور شاہ کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے نمائندہ فکشن نگاروں میں نور شاہ کا شمار ہوتا ہے۔انہوں نے ناول،افسانے،ڈرامے،سیریل ڈائری،خاکے اور بچوں کے لئے کہانیاں وغیرہ لکھیں ہیں۔ نور شاہ کا اصل میدان صنف افسانہ ہے جس میں انھوں نے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔صنف افسانہ میں نور شاہ نے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں بلکہ بیرون ریاست اور پورے برصغیر میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے اور عصر حاضر میں اردو افسانہ کو تقویت بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

نور شاہ کو اردو ادب سے بہت گہرا شغف ہے اس لئے نور شاہ نے اردو ادب کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔نور شاہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ ''گلاب اور پھول'' سے کیا ہے۔نور شاہ کا یہ افسانہ دہلی سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔یہ افسانہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''بے گھاٹ کی ناؤ'' میں شامل ہے۔شروع شروع میں نور شاہ کو اپنے افسانے یا کہانی شائع کرانے میں بہت زیادہ پریشانیوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔بہت کوشش اور جدوجہد کرنے کے باوجود بھی مدیر اُن کی کہانی اور افسانے شائع نہیں کرتے تھے اور صرف یہی بات بار بار دہراتے تھے کہ آپ کی کہانی ہمارے رسالے کے معیار پر کھری نہیں اُترتی تو ان تمام باتوں سے تنگ آکر نور شاہ نے ایک ایسی راہ نکالی کہ جس کی وجہ سے اُن کے افسانے تواتر کے ساتھ چھپنے لگے۔اور تحفے اور تحائف کی بھرمار ہونے لگی۔ان تمام باتوں کا راز یہ تھا کہ نور شاہ نے ایک زنانہ نام ''شاہدہ شیریں'' کے نام سے افسانے شائع کروانے شروع کیے۔نور شاہ نے اپنی اس بات کی تصدیق اپنے ایک شخصی انٹرویو میں کی ہے۔محمد اقبال لون نے لیا ہے جو ان کی کتاب ''فکر و فن'' کے صفحہ نمبر ۲۸ پر موجود ہے۔اس انٹرویو مین نور شاہ نے اس راز کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''ہاں میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک زنانہ نام ''شاہدہ

شیریں'' سے کیا تھا۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بنا پر جب میں نے محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود بھی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے ایک نام ور مدیر کے نام ارسال کی، بہت دنوں تک جواب نہیں آیا اور پھر جو جواب آیا وہ وہی جواب تھا جو نئے نئے لکھنے والوں کو عام طور سے ملتا ہے۔ یعنی آپ کی کہانی ہمارے رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ہم اسے شائع کرنے سے معزور ہیں۔ اپنی کہانی کا یہ انجام دیکھ کر دل ٹوٹ گیا لیکن افسانوی ذہن ایک اور چال چلا۔ میں نے کہانی کا عنوان اور اپنا نام بدلنے کی ٹھان لی۔ کہانی کے شروع کے جملے بدل دیے۔ بہر حال نئے عنوان اور نئے نام کے ساتھ کہانی مدیر محترم کو بھجوائی اب کے جو خط ملا وہ دلچسپ تھا میری یہ کہانی نسوانی نام سے شائع ہوئی اور اس طرف شاہدہ شیرین کا جنم ہوا۔''[1]

نورشاہ کو اس نام ''شاہدہ شیرین'' کی وجہ سے بہت سی پذیرائی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس زنانہ نام کا نہ صرف سہارہ لے کر افسانے اور کہانیاں شائع کرنا شروع کیں بلکہ اُن کو اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیت کی طرف سے تحفے اور تحائف بھی موصول ہوئے۔ جیسے ہی ادبی دنیا میں نورشاہ کا پہلا افسانہ ''گلاب اور پھول'' شائع ہوا تو نورشاہ نے پلٹ کر پیچھے کی جانب نہیں دیکھا اور اردو دنیا پر خاص کر افسانے پر اپنی ایسی دھاک بٹھائی جو کہ اب تک قائم و دائم ہے۔ انھوں نے نہ صرف افسانے لکھے بلکہ ڈرامے کی دنیا کے بھی وہ بے تاج بادشاہ بنے۔ انھوں نے اپنا پہلا ڈراما جو لکھا اُس نے اردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔ اردو ادب میں اُن کا یہ ڈراما کئی بار اسٹیج بھی کیا گیا مگر بڑے اسٹیجوں کی زینت نہیں بنا۔

اس ڈرامے کا عنوان ہے ''میری دھرتی میری جنت'' اس ڈرامے کا پورا کلائیمکس کشمیر کی تہذیب کے ارد گرد گھومتا ہے۔اس ڈرامے میں انہوں نے کشمیر کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ایک وہ پُر اَمن کشمیر جس میں کلیاں، پھول اور سبزا اور سنوبر مہکتے ہیں اور دوسری طرف آج کا پُر فتن کشمیر جس میں صرف بارود کا ڈھیر، لاشوں کے انبار اور ظلم و بربریت کی آہ وفغاں چیخیں سُنائی دیتی ہیں۔اس ڈرامے کے علاوہ اُن کے دو ڈرامے اور بھی ہے جو منظر عام پر آ چکے ہے۔''سفر زندگی کا'' اور ''وادیاں خاموش ہیں''۔نور شاہ نے ڈراموں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔اُن کا پہلا ناول ''نیلی جھیل کالے سائے'' کے عنوان سے ہے جو ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔اُن کا دوسرا ناول ''پائل کے زخم'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔اُن کا تیسرا ناول ''لمحے اور زنجیرے'' ہے۔اس ناول نے اردو ادب میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔یہ ناول ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ نور شاہ کا ناولٹ ''آدھی رات کا سورج'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

نور شاہ نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات اپنی پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' سے کی تھی جو ۱۹۶۰ء میں ماہنامہ بیسویں صدی دہلی سے شائع ہوئی۔نور شاہ کا پہلا ریڈیو ڈرامہ ''دل کی روشنی'' کے نام سے ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا۔نور شاہ کی اہم تصانیف اُن کے افسانوی مجموعے ہیں اور راقم کا کام بھی نور شاہ کے افسانوں کے حوالے سے ہی ہے۔نور شاہ نے افسانے میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔اُن کے افسانوی مجموعوں کی کل تعداد گیارہ ہے۔اُن کے افسانوی مجموعے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' (۱۹۶۰)

۲۔ ''ویرانے کے پھول'' (۱۹۶۲)

۳۔ ''ایک رات کی ملکہ'' (۱۹۶۴)

۴۔ ''من کا آنگن اُداس اُداس'' (۱۹۶۵)

۵۔ ''گیلے پتھروں کی مہک'' (۱۹۸۴)

۶۔ ''بے ثمر سچ'' (۲۰۰۵)

۷۔ ’’آسمان پھول اور لہو‘‘ (۲۰۰۹)

۸۔ ’’کشمیر کہانی‘‘ (۲۰۱۲)

۹۔ ’’کیسا ہے یہ جنون‘‘ (۲۰۱۵)

۱۰۔ ’’ایک معمولی آدمی‘‘

۱ ۱۔ ’’لفظ لفظ داستان‘‘ (۲۰۲۰)

نور شاہ نے افسانوں کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔اُن کی دیگر تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

۱۔انتخابِ اردو ادب ریاست جموں وکشمیر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء

۲۔بند کمرے کی کھڑکی ’’ڈائری کے اوراق پر مشتمل یادیں‘‘ ۲۰۰۷ء

۳۔نور شاہ کے تین ناولٹ (مرتب روف رافت) ۲۰۰۹ء

۴۔کہاں گئے یہ لوگ (ادبی خاکے) ۲۰۰۹ء

۵۔ریاست جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار (فن،شخصیت اور مقالمہ) ۲۰۱۱ء

۶۔کشمیر نامہ (مرحوم عمر مجید کے اخباری تخلیقات کا انتخاب) مرتب نور شاہ، جاوید ماٹجی ۲۰۱۲ء

۷۔کشمیر کہانی (کشمیر کے پُر آشوب دور کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں اور ڈراموں کا انتخاب) ۲۰۱۴ء

۸۔کیسا ہے یہ جنون (افسانے،افسانچے،ڈرامے،فیچر،سیلاب،کہانیاں اور ترجمے) ۲۰۱۵

اُنہوں نے ریڈیو کے لئے بھی بہت سارے ڈرامے لکھے ہیں جو نشر بھی ہوئے ہیں۔نور شاہ نے ستر سے زائد ڈرامے لکھے ہیں۔ان میں سے اکثر ڈرامے ریڈیو کشمیر اور ریڈیو جموں سے نشر ہوئے ہیں۔اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے۔

نور شاہ کی کچھ گیتوں بھری کہانیاں بھی ہیں جو ترنم کے ساتھ ریڈیو کشمیر سے گائی جاتی ہیں

۱۔کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے نورشاہ نے اب تک تیس سے زائد گیتوں بھری کہانیاں قلم بند کی ہیں جونشر بھی ہوئیں ہیں۔

۲۔کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے کچھ یادیں، کچھ باتیں کے عنوان سے فلمی اور غیر فلمی شخصیات کے تعلق سے ہفتہ روزہ پروگرام کے لئے قلمی معاونت۔

نورشاہ نے ٹی وی سیریل کے لئے بھی کہانیاں لکھیں ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔درد کا رشتہ (۱۳ کڑیاں)

۲۔گُل اور بلبل (۱۳ کڑیاں)

۳۔سچ کا سپنا (۱۳ کڑیاں)

۴۔نیلم (۱۳ کڑیاں)

۵۔زندگی کا سفر ٹیلی فلم

۶۔کشمیر میں اردو (دستاویزی فیچر ۳۰ فٹ کے لئے)

۷۔جموں وکشمیر سمشی توانائی (چار قسطیں پرسار بھارتی کے لئے)

۸۔گُل رات کا سورج نامی کہانی پر مبنی ٹیلی فلم

نورشاہ کی افسانوی فضا رومانی ہے وہ جمالیاتی ذوق احساس رکھتے ہیں اس لئے ان کی کہانیوں کی تمام تر فضا رومانی ہے۔ان کے افسانوں میں کشمیری سماج اور ماحول کی عکاسی ضرور ملتی ہے لیکن عشق و رومان ان کہانیوں کا بنیادی محور بھی ہے۔ان کی کہانیوں کے موضوعات اوران کے ادبی سفر پر اظہار خیال کرتے ہوئے دیپک بدکی رقمطراز ہیں:

''نورشاہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے دل میں پون صدی کے تغیرات، انقلابات، قوم کا المیہ، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور انسان کا درد و کرب لیے ہمیں آج بھی اپنے رومانی افسانوں،

ماضی کی یاداشتوں ،دلفریب خاکوں اور پارینہ روزناموں سے
محظوظ کررہے ہیں۔تقریباً ساٹھ سال پہلے انہوں نے سجاد حیدر
یلدرم سکول کی پیروی میں اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا جس کی
آبیاری گزشتہ صدی ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی کرتا رہا۔نورشاہ
کی اکثرو بیشتر کہانی او اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنتی
رہیں۔عشق و محبت کی جادوئی کہانیاں، افلاطونی کردار اور
جمالیاتی موضوعات نورشاہ نے خود بھی رومان پرور طبیعت پائی
ہے جو حُسن و جمال کی انتہا دیکھنے کی متلاشی ہے۔نورشاہ کے
تقریباً تمام تر افسانوی مجموعے رومان پر ہی ہیں سوائے چند
افسانوں کے جن میں انہوں نے کشمیر کا ذکر کیا ہے اور کشمیر کی
خوبصورتی کے متعلق بیان کیا ہے۔'' ۲؎

اردو کے محقق و ناقد عبدالقادر سروری نورشاہ کے افسانوں کے موضوعات، کردار، حقیقت نگاری اورڈرامائی انداز کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نورشاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے
والے افسانہ نگار ہے۔کہانی لکھنے میں انہیں نہ صرف ذوق ہے،
بلکہ سلیقہ اوراچھا سلیقہ ہے۔ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر
موضوع سے ایک مؤثر افسانہ اور مؤقف سے دلچسپ مرقع پیدا
کرسکتے ہے جہاں ان کے موضوع میں دَم نہیں، اسے بھی اپنے
پیش کشی کے انداز اور فنی چابکدستی سے وہ جیتا جاگتا بنانے کی
کوشش کرتے ہے۔سینکڑوں کردار انہوں نے پیدا کیے ہیں،

تاہم ان میں یکسانیت بہت کم ہے۔ وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں لیکن رومانی حقائق کے۔ نورشاہ کرداروں کی بیرونی رنگ کاری کے علاوہ اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانوں میں ڈرامائی مؤقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔'' ۳؎

نورشاہ کی اردو ادب کی طرف مائل ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے خاندان کے تمام افراد کو اردو ادب سے گہرا شغف تھا اور گھر میں اچھا خاصہ ماحول تھا۔ اردو بولنے کا اور اردو ادب کو سننے کا، اسی ماحول سے ترغیب پا کر نورشاہ نے افسانے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عمر بھر اسی کے ہوکر رہ گئے۔ نورشاہ کے افسانوں میں انسانی زندگی کی مجبوریاں اور ناکامیوں کے اظہار کے علاوہ ان کے شاعرانہ اسلوب کے بارے میں اظہا خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی فرماتے ہیں:

''نورشاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں، ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جن سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آگیے ہیں۔ اور اس خصوصیت نے نورشاہ کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نورشاہ افسانہ بُننے کے گُر سے بھی واقف ہے۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہوگئی۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''مَن کا آنگن اُداس اُداس''، اور '' گیلے پتھروں کی مہک'' جیسے افسانے قابلِ قدر ہے۔ اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ ہے۔'' ۴؎

ان نامور دانشوروں کی آرا سے اندازہ ہوتا ہے کہ نورشاہ کی افسانہ نگاری میں رومانیت اور حقیقت دونوں کا عکس نظر آتا ہے۔اور تمام بڑے ناقدین اور دانشوروں نے ان کے افسانون کوسراہا ہے۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی نورشاہ کی کہانیوں اور ان کی شخصیت سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے ہوئے لکھتی ہیں:

''ماہنامہ بیسویں صدی'' ایسا رسالہ ہے جسے ہر عمر کے لوگ پڑھتے رہے ہے۔اب یہ تیسرے نسل کے ذہنوں کی آبیاری کررہا ہے۔میرے بچپن میں یہ رسالہ ہمارے گھر میں آتا تھا۔اماں بڑے ذوق و شوق پڑھا کرتی تھیں۔جب میں آٹھویں کلاس میں تھیں نورشاہ کی کہانی پڑی (نام ذہن میں نہیں)اور پھر یوں ہوا جب جب ان کی کہانیاں پڑھتی تو صبر کی آنکھ سے انہیں دیکھتی خود ان کی کہانیوں میں انہیں تلاش کرتی ،یہ تلاش اس دن ختم ہوئی جب پہلی بار ۱۹۸۱ء میں دفتر بیسویں صدی دریا گنج میں وہ نیر صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔سادگی ومتانت کا مجسمہ، بات کرنے کا دیما دیما انداز محسوس ہورہا تھا کہ یہ وہی فنکار ہے جس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر میں نے شعور کی منزلین طے کیں ہیں۔ مزاج میں بے حد انکساری رچی ہوئی تھی۔ دورانِ گفتگو اُنہوں نے بتایا'' مانامہ بیسویں صدی''میں تخلیق کا شائع ہوجانا کسی بھی فنکار کے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔گویا اس میں شائع ہونے کے بعد مستند ہونے کی مور لگ جاتی تھی۔'' ۵؎

نور شاہ ایسے ادیب ہیں جن کا تخلیقی سفر چھ دہائیوں پر محیط ہے۔تا حال ان کا یہ سفر اسی انداز میں رواں دواں ہے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ ایک خاص مدعت کے بعد فنکار خود کو دہرانے لگتا ہے۔لیکن نور شاہ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ان کی تحریروں میں موضوعات کا تنوع ہے۔نور شاہ کا ذہن بے حد ذرخیز ہے۔ پیدائشی کشمیری ہونے کے سبب وہ کشمیر کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ وہاں کے ہر گوشے پر ان کی نگاہ ٹھہرتی ہے۔انہوں نے کشمیر کے ہر موسم کو دیکھا اور لطف اُٹھایا ہے۔ وہاں کی صحت بخش ہواؤں اور چشموں کے ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں سے اپنی روح کو سیراب کیا ہے۔اس لئے ان کا کلام وہاں کی خوبصورتی اور حُسن کو نہایت روانی سے صفۂ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل ''حُسن'' ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور نور شاہ کے یہاں اس کا اظہار بھر پور انداز میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حُسن ان کے فن،ان کی زندگی اور ان کے ماحول کا حوالہ بن کر شہپاروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

نور شاہ کی کہانیوں میں ان کی محبوبہ اس لیے اہم نہیں کہ وہ حُسن پرستی کی تسکین کرتی ہے۔ یا اس کی دل نواز ادائیں مَن کو موہ لیتی ہیں بلکہ اس کا وجود حُسن کی تخلیق کا باعث بنتا ہے اور پھر وہی حُسن ان کے افسانوں میں جا بجا محسوس کیا جاتا ہے۔شمع افروز زیدی ان کی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ مجھے برسوں قبل ان کے تحریر کردہ بعض افسانے یاد آرہے ہیں جو کہانی پن کے ساتھ ہی شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں ،پُر شور دریاؤں کی گونج،سبک رو ندیوں کے نغمے، چناروں کے دہکتے پتے، پھول،مرغزاروں، وادیوں، چشموں، شالیمار اور نشاط باغ کے دلکش مناظر اتنی خوبصورتی سے سموئے ہوئے ہیں جنہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔اُن کی کہانیوں میں ڈل جھیل، کنول، زعفران کے پھول، انار کی کلیاں ، بادام کے شگوفے ،شفتالو،چشمے کا ٹھنڈا پانی ، پری محل ،گلمرگ ،سون مرگ ،ٹنگمرگ، پہلگام وغیرہ ایسی علامتیں بن کر اُبھری ہیں جو ان کی تحریروں کا اہم عنصر بن گئی ہیں۔

نورشاہ نے اپنی کہانیوں میں کشمیر کی خوبصورتی ، وہاں کے دل نواز مناظر، حسین وادیاں ، ہرے بھری مرگزار، روح پرور فضائیں، آبشار، سڑکیں ، دریا، آسمان ، درخت، جنگل ، پہاڑ جھرنے غرض وہاں کے گوشے گوشے کے حُسن کو بڑی خوبی اور ہنرمندی کے ذریعے کہانیوں کے قالب میں ڈھالا ہے کہ قاری ذہنی طور پر کشمیر کی وادیوں کی سیر کرنے لگتا ہے۔ اور وہاں کے حُسن اور روح پرور مناظر سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کشمیر کے خوبصورت قدرتی مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے نورشاہ نے اپنے افسانے میں منظر کشی کا کمال دکھایا ہے۔ ایک مثال یہاں ملاحظہ کیجئے:

> ''ہری بھری شاداب وادیاں ،سندر درتی ، بانت بانت کے لوگوں کا گھر، پہاڑ جن کی قوت میں ہرے بھرے جنگل ہے۔ جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے۔سبز ہے، یہ پھلوں سے جھڑی ہوئی مرگیں ہیں، رنگ بہ رنگے پھولوں سے سجے سجائے تختے ہیں، یہ گلمرگ ،سونہ مرگ، پہلگام، یہ شالیمار، یہ نشاط،نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار یہ ڈل جھیل ہے اور اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دُلہن کی طرح سجے سنورے ہوس بوٹ، یہ لدر نالہ ہے۔ یہ گل گل کرتی ندیاں اور ان کے کنارے بید کے پیڑوں کی قطاریں ، چنار کے پتوں کا لال رنگ، کھیتوں میں پکے ہوئے اناج کی سرخ بالیاں۔'' ۶

نورشاہ کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے۔ اسلئے انھوں نے اپنے افسانوں میں سادہ سلیس اسلوب کے ساتھ شگفتہ اور دلکش انداز بیان بھی اپنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں منظر

نگاری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، ڈاکٹر شمع افروز زیدی ان کے اسلوب اور منظر کشی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''نورشاہ کا بیانیہ پختہ، دلکش اور رواں دواں ہے۔ وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر میں قاری کو نہیں اُلجاتے۔ بوجھل اور ثقیل الفاظ سے پرہیز کرتے ہے۔ ان کے قلم میں تازگی ہے۔ زبان سلیس، سادہ اور پُرکار ہونے کے علاوہ کراروں کے زبان سے جملوں کی فطری ادائیگی، کہانی کار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی سبب نورشاہ کی تحریروں میں پڑھنے جانے کی ایسی بھرپور قوت ہے کہ عام قاری بھی اسے نہایت دلچسپی سے آخر تک پڑھ کر ہی دَم لیتا ہے۔ اور یہی خوبی فنکار کی سب سے بڑی کا کامیابی ہوتی ہے۔ نورشاہ کے افسانوں کی ایک اور خوبی ان کی منظر نگاری ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر مطلوبہ منظر کا ہوبہو عکس بنانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔'' ۷

نورشاہ نے عورت کی عظمت، ذہانت، ارادے کی پختگی اور اس کی مظلومیت کو اپنی کہانیوں کا محور نہیں بنایا ہے۔ انہوں نے عورت کو صرف وفا کی دیوی کے روپ میں ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ ان کے خیال میں بے وفا اگر مرد ہوسکتا ہے تو عورت بھی ہوسکتی ہے۔ نورشاہ کی کہانیوں کو اگر جستہ جستہ پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تنوع ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق نفسیاتی کشمکش، حالات اور ماحول کا المیہ اس خوبی سے سموتے ہیں کہ قاری کے ذہن ودل پر کاری ضرب لگتی ہے۔ لیکن اس کاری ضرب کو سنبھالنے کے ہُنر سے وہ بھی بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے قاری کو لطیف رومانی ماحول بھی فراہم کرتے ہیں اور حُسن کا ذکر اس دلکش پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن سے دکھوں کے

بادل چھٹ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اشرف آثاری اپنے ایک مضمون میں نور شاہ کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''نور شاہ ایک فرد کی جبلتوں پر اکثر اپنی کہانیوں میں فوکس کرتے ہیں۔نور شاہ کی کہانیوں کا یہ خاص متاثر کن اور فکر انگیز ہوتا ہے۔عصر حاضر کے معروف کہانی کاروں کا ایک اہم رول کہانی کو اساطیری، داستانیں خیالی اور مافوق الفطرت کرداروں اور واقعات سے باہر نکال کر حقیقت نگاری سے ہمکنار کرنا بھی ہے۔کسی افسانہ نگار کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کا یہ واضح ثبوت ہے کہ وقت کے ساتھ چلے افسردہ نہ بنے'' ۸

نور شاہ کے بارے میں ہر ایک بڑے فکشن نگار نے کہا ہے کہ اُن کے افسانوں اور کہانیوں میں ایسی بھرپور قوت ہے کہ عام قاری بھی اُسے نہایت دلچسپی سے اوّل سے آخر تک پڑھ کر ہی دَم لیتا ہے۔اور یہی خصوصیت کسی بھی بڑے قلم کار کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں کو چابکدستی سے بننے کی کوشش کرتا ہے۔تاکہ پڑھنے والے کے ذہن پر ہمیشہ اس کا تاثر برقرار رہے۔یہی خاصیت ہمیں نور شاہ کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔

عصر حاضر میں بحیثیت افسانہ نویس نور شاہ کی شناخت مستحکم ہے۔گزشتہ پچاس برسوں پر نور شاہ کا ادبی سفر محیط ہے۔ ان کے اکثر افسانے فنی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔نور شاہ نے افسانہ نویسی کے لئے خصوصی طور پر ایک منفرد طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے۔جس پر اب بھی مستعدی کے ساتھ گامزن ہیں۔مصلحت پسندی یا نظر اندازی سے وہ سمجھوتا نہ کر پائے اور نہ ہی وہ ہوا کے رُخ پر پھسلنے کے عادی ہیں۔اپنے افسانوں میں نور شاہ انسانی

فطرت اور جذبات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ان کی اکثر کہانیوں کے مطالعے پر حقیقت ووضع ہوتی ہے۔جو کردار واضع کئے گئے ہیں وہ سب کے سب حقیقی اور جاندار ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے وہ قارئین کو اپنے ساتھ باندھے رکھتے ہیں۔ ہمارے تہذیبی ،معاشرتی اور سماجی اقدار اس ترقی یافتہ عہد میں جس سرعت کے ساتھ پامال ہورہے ہیں ان کے اثرات نورشاہ کی تحریروں میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

نورشاہ کے بیشتر افسانے ذاتی تجربے،صحت مند فکر، وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی غمازی کرتے ہیں۔کسی منظر کی عکاسی کرتے وقت اس کا چھوٹے سے چھوٹا پہلو بھی ان کی نظروں سے اُوجھل نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ بڑے بڑے نقطے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لفظوں کی آبیاری نورشاہ خونِ جگر سے کرتے ہیں۔منظر کشی میں بھی ان کا قلم ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ان کا ہر افسانہ ایک مکمل زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ہر مکتبہ فکر کے قاری کے لئے ان کی کہانیوں میں کچھ نہ کچھ مثبت پہلو موجود نہیں ہوتے۔خود اعتمادی کا دامن تھامے نورشاہ سطحیت ، جذباتیت یا نعرہ بازی سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔مواد اور ہیئت میں رشتہ ہر حال میں قائم رکھنے اور فن اور موضوع کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ان کو واقعی یدِ طولیٰ حاصل ہے۔''بے گاٹ کی ناؤ'' سے لے کر'' کیسا ہے یہ جنون'' تک نورشاہ نے قادرالکلامی کی نہج پر گامزن ایک مخصوص رویہ اپنایا ہے۔اس اپنائے گیے رویے یا رنگ میں طبع آزمائی کر کے دنیائے ادب کو عمدہ افسانے دیئے ہیں۔اور آج بھی اس عمر میں آب وتاب کے ساتھ لکھنے کی مشق جاری ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی پہلی ہی تخلیق کے باعث نورشاہ اردو ادب میں معتبر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

حوالہ جات

۱۔محمد اقبال لون،فکر و فکشن،میزان پبلیشر بک ڈپو سرینگر،ص ۲۴

۲۔نور شاہ،کیسا ہے یہ جنون،الفجر پرنٹرس سرینگر،۲۰۱۵،ص ۳۲

۳۔عبدالقادر سروری،کشمیر میں اردو۔،جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز،سرینگر، کشمیر تیسرا حصہ۔،۱۹۸۴ء،ص ۲۵

۴۔ڈاکٹر برج پریمی۔،اردو افسانہ ریاست میں،انتخاب اردو ادب،ص ۴۸

۵۔ایضاً،ص ۹۱

۶۔نور شاہ،افسانہ اندھیرے اجالے،ص ۷۹

۷۔نور شاہ،کیسا ہے یہ جنون،الفجر پرنٹرس سرینگر،۲۰۱۵،ص ۱۵

۸۔ڈاکٹر فاروق احمد وانی،شجر ثمر دار،میزان پبلیشر سرینگر،ص ۲۷۲

باب دوم

کشمیر کا تہذیبی، تاریخی و ادبی منظر نامہ

کشمیر کا تہذیبی، تاریخی وادبی منظر نامہ

ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کا وہ خوبصورت حصّہ ہے جس کو ہندوستان کا تاج بھی مانا جاتا ہے اوراپنی خوبصورتی اورزیبائش سے اس کو جنتِ بےنظیر کہا جاتا ہے۔اس سے پہلے کہ ہم کشمیر کی تہذیب یہاں کے پکوان ،لباس ،ثقافت اوررسم ورواج پر بات کریں یہ بھی ضروری ہے کہ اس خطے کے نام کی اہمیت سے آپ کو آشنا کرادیا جائے کہ اس وادی کا نام کشمیر کیسے پڑااورکس نے اس کا نام کشمیر رکھا۔

کشمیر کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماقبل تاریخ میں خطۂ ارض ایک بہت بڑی جھیل تھا۔جس کا نام ’ستی سر‘ تھااوراس جھیل کے کناروں پر پیشاچ (کش)اورناگ قبائل کےلوگ آباد تھے۔ان کا سردار کشپ ریشی تھا۔جھیل کا وادی میں تبدیل ہونے کے متعلق کئی روایتیں ملتی ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ کشب ریشی نے اس جھیل میں عبادت کی خاطر ایشور سے زمین مانگی اورایشورنے دیوتاؤں کو بھیج کر پہاڑ میں رخنے پیدا کئے ۔ایک اورروایت یہ بھی ہے کہ کشپ کی التجا پر وشنو کے بھائی بلھبدر نے اپنے ہل کو پہاڑوں میں چلاکر پانی کی نکاسی کے لیے راستہ بنالیااور بعد میں وشنو نے راکشش جل دیو کو مارڈالا۔

جس جگہ پر پانی کی نکاسی ہوئی اس جگہ کا نام ورمول (بارہ مولہ) پڑگیا اور کشپ رشی نام کی مناسبت کی وجہ سے اس سرزمین کو کشپ مارا کہا گیااوریہی لفظ پھر بدلتے بدلتے کشمیر بلکہ کشمیری میں کشیر بن گیا۔

بعض مصنفین کے نزدیک کشمیر نام نوح کے بیٹے کش کی مناسبت کی وجہ سے ہے۔کش کی اولاد جہاں جہاں آباد ہوئی اُنہوں نے اس جگہ کواپنے جد کے نام سے منسوب کیا۔مثلاً کش،کشان،کاشفر اور اس طرح کشمیر،کشمیر میں آباد ہانجی طبقہ خودکونوح کی اولاد سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ تمام تر اقوال زریں ہمیں نیل مت پران اورراج ترنگی سے ملتے ہیں۔

اس خطے اور کشمیر کے نام کے حوالے سے مختلف روایات تواریخ کشمیر میں درج ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ خطہ پانچ ہزار سال قبل مسیح سے تاریخ کی روشنی میں ہے۔ اس وادی کا قدیم نام ''سرستی'' تھا۔ طوفانِ نوح کے بعد یہ وادی پیالہ نما جھیل بن گئی۔

کشپ موسم گرما میں سیر وتفریح کے لیے اس وادی میں آیا تو اس نے دیکھا کہ بارہ مولہ کے مقام پر ایک بڑی چٹان نے پانی روک رکھا ہے۔ راجا نے چٹان کے ٹکڑے کرا دیے پانی کا دھارا بہہ نکلا۔ ''سرسی'' کا پانی خشک ہو گیا تو قابل کاشت زمین نکل آئی۔ راجا نے یہاں لوگوں کو آباد کیا اور یہ خطہ راجا کشپ کے نام کی نسبت سے کشپ کہلانے لگا اور بعد میں کشمیر کے نام سے مشہور ہو گیا۔

کشمیر کی تہذیب کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم تہذیب کے بارے میں اچھے طریقے سے آگاہ ہو جائیں۔ ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے۔ اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیت ہوتی ہیں جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں۔ ہر قومی تہذیب اپنی اپنی انفرادی خوصوصیت سے پہچانی جاتی ہے۔

اسی طرح کشمیر کی بھی اپنی ایک منفرد تہذیب ہے اور اسی تہذیب کی وجہ سے یہ ریاست باقی تمام ریاستوں سے مختلف مانی جاتی ہے۔ یہاں کا رہن سہن یہاں کا کھان پان اور یہاں کا پہناوا یہاں کی آب وہوا اپنے آپ میں ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

اردو، فارسی اور عربی میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں کس درخت یا پودے کو کاٹنا، چھانٹنا، تراشنا تا کہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں، فارسی میں تہذیب کے معنی ''آراستن پیراستن، پاک و درست کردن و اصلاح نمودن'' ہیں، اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا مہذب یا تہذیب یافتہ ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ شخص مذکور کی بات چیت

کرنے ،اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا انداز اور رہن سہن کا طریقہ ہمارے روایتی معیار کے مطابق ہے۔
تہذیب کی اصطلاح اردو تصنیفات میں ہمیں سب سے پہلے تذکرہ گلشن ہند میں ملتی ہے۔

''جوان مؤدب و باشعور اور تہذیب اخلاق جلالی سے معمور ہیں'' اسی زمانہ میں مولوی عنایت اللہ نے اخلاقی جلالی کا ترجمہ جامع اخلاق کے نام سے کیا۔ یہ کتاب احمدی پریس کلکتہ سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔ مولوی عنایت اللہ کتاب کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں کہ ''اس نے اپنے خواص مخلوقات کو زیور تہذیب الاخلاق سے مہذب اور عوامِ موجودات کے ہیں ان کی بیعت سے مآدب کیا۔'' ۱

اسی نوع کی ایک اور تحریر کبیر الدین حیدر عرف محمد میر لکھنوی کی ہے۔ وہ ڈاکٹر جانسن کی کتاب تواریخ راسکس کے ترجمہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''زبان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم و فراست کو تہذیب اخلاق بخوبی ہو۔'' ۲

سرسید احمد خان غالباً پہلے دانشور ہیں جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔ انہوں نے تہذیب کی جامع تعریف کی اور تہذیب کے عناصر وعوامل کا بھی جائزہ لیا۔ چنانچہ اپنے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے سرسید پرچے کی پہلی اشاعت (۱۸۷۰ء) میں لکھتے ہیں کہ:

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولزیشن یعنی تہذیب افتاد کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب

قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلائیں۔'' ۳۲

سولزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت وتمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔

تہذیب کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے مگر تہذیب کا اصل مقصد نکل کر سامنے یہی آتا ہے کہ کسی بھی معاشرے کی اچھی نشو ونما، رہن سہن اور اچھے اخلاق کو ہی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب کسی معاشرے کی با مقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو بھی تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرزِ فکر اور احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ، زبان، آلات و اوزار پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے رہن سہن، فنون لطیفہ، علم وادب، فلسفہ وحکمت، اخلاق و عادات، رسوم وروایات، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔

ماحول اور معاشرہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں، اگر ہم اس اعتبار سے تہذیب اور ثقافت کے رویوں کی شناخت کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ثقافت جماعت کے ذہنی وجذباتی ماحول سے عبارت ہے جب کہ تہذیب، اس ذہنی وجذباتی ماحول کے مادی مظاہر کا نام ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' میں تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی

جماعت رکھتی ہے۔ جسے وہ اپنے اجتماعی اورات میں ایک
معروضی شکل دیتی ہے جسے افراد اپنے جذبات ورجحانات اپنے
سجاؤ اور برتاو میں ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیا
پرڈالتے ہیں۔'' ۴

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک تہذیب کے معنی ومفہوم یوں ہیں:

''کلچر کسی نظام فکر کے سایہ دار درخت کا وہ پھل پھول ہے جس
سے کسی معاشرے کے احساس و جمال، افادی اندازِ نظر آ سکے
فکر و عمل کی خوشبو اسکے رویوں اور ہر دم بدلتی آگے بڑھتی زندگی کی
سمت کا پتا چلتا ہے، ہر کلچر کی بنیاد......ایک مخصوص نظامِ فکر یا مابعد
الطبیعات پر ہوتی ہے جیسا نظام فکر ہوگا ویسا ہی کلچر بھی ہوگا اور
اس معاشرے کا فکر و عمل بھی اسے سے متعین ہوگا۔'' ۵

ہمیں چاہیے کہ کسی بھی تہذیب کو جاننے کے لئے اس کا پتہ لگائیں کہ اس تہذیب کا دنیاوی زندگی کے بارے میں کیا نظریہ ہے۔ کیا جو تہذیب ہم اپنے روزمرہ کے سماج میں جس کا ذکر کرتے ہیں اچھے کردار اچھے اوصاف ہونا یہی تہذیب کہلائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر بنی بخش بلوچ کے مطابق تہذیب کے تین پہلو ہوتے ہیں۔

۱۔ مادی پہلو
۲۔ عملی پہلو
۳۔ جذباتی پہلو

مادی پہلو: یعنی قدرتی ماحول۔

عملی پہلو: یعنی نشت و برخاست کے آداب، پیدائش، موت، شادی بیاہ اور دوسری معاشرتی

رسوم غذا، لباس اور مجلس زندگی وغیرہ۔

جذباتی پہلو: یعنی فنون جملیہ اور فکر جذبات کے اظہار کے دوسرے مسائل"۔ ۶

ہر ایک مفکر نے اپنے اپنے زاویے سے تہذیب کو مختلف طریقے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اسی طرح انگریزی دانشور حضرات نے کلچر و تہذیب اور ثقافت سے متعلق چند تعریفوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔

مشہور انگریزی دانشور ڈاوسن (Dawson) نے لکھا ہے کہ: "A culture is a common way of life particular adjestment of man to his natural surrounding and his economic needs."

"تہذیب زندگی کی وہ راہ ہے جہاں انسان اپنے اردگرد ماحول اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنا ایک خاص مقام بناتا ہے۔" ۷

ہرس کووٹس (Haris Kouta) نے تہذیب کی تعریف یوں کی ہے۔:

"تہذیب انسان کا سیکھا ہوا طریقہ ہے...... یعنی وہ تمام چیزیں جو انسان کے پاس ہیں خواہ کرنے کی ہوں یا سوچنے کی ثقافت کہلائے گی۔" ۸

الغرض ہم نے تمام انگریزی اور اردو مفکرین کی رائے تہذیب کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف زبانوں میں تہذیب کی مختلف اعتبار سے تعریف کی گئی ہے اور بالعموم سب ایک ہی نکتے پر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ معاشرے کی اچھی نشوونما اور رہن سہن کو ہی تہذیب کہتے ہیں۔

کشمیر کی تہذیب وتمدن اور ثقافت اور خوبصورتی کے متعلق رسول پونیر لکھتے ہیں۔

''جغرافیائی حالات کسی بھی ملک کے تاریخ پر اثر انداز رہے ہیں۔وادی کشمیر کے فلک بوس پہاڑ،آبشاروں،ندیوں اور آب و ہوا نے یہاں کے لوگوں کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔یہ سبھی چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں،لیکن وادی کشمیر ہر طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔سر بکف برفیلے پہاڑ جو اس کی فصیل کی جنت سے عظیم نہگیاں کا کام دیتے آئے ہیں۔ہماری تمدنی اور تہذیبی زندگی پر بھی بارش،سیلاب اور قحط سالی وغیرہ جیس آفتیں پر دور میں اثر انداز ہوئی ہیں،غور سے دیکھا جائے تو جغرافیہ کو کسی بھی ملک کی تہذیب کے زوال وارتقا میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔کشمیر سے بین الاقوامی دلچسپاں اس کی جغرافیہ کی مرہون منت ہیں۔'' 9

کشمیری تہذیب کے بارے میں اگر ذکر کیا جائے تو یہاں کی تہذیب ہندوستان کی تمام دوسری ریاستوں سے بالکل الگ ہے چونکہ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے،وہ کشمیری زبان ہے جو کسی بھی دوسری ریاست کی زبان سے مماثلت نہیں رکھتی ہے۔یہان کا رہن سہن یہاں کا کھان پان ہر چیز الگ ہے اور یہاں کی شادی بیاہ کے رسومات وغیرہ سب الگ اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔

تہذیب ایک ایسی چیز ہے جو معاشروں کو آپس میں جوڑتی بھی ہے اور انہیں ایک دوسرے سے مختلف بھی بناتی ہے۔آج دنیا چاہے عالمی سطح پر ایک ہی گاؤں تسلیم کی جاتی ہے،لیکن اس عالمی گاؤں میں بھی چھوٹی چھوٹی کئی تہذیبیں اپنا الگ وجود قائم کئے ہوئے ہیں۔عالمی گاؤں کی تو الگ بات ہے ہر ملک

کی اپنی اپنی الگ تہذیبیں ہیں۔ملک بھی چھوٹی چھوٹی تہذیبوں میں بٹا ہوتا ہے۔مثلاً ہندوستان میں بنگالی تہذیب،آسامی تہذیب،راجستھانی تہذیب،بہاری تہذیب ،تلگوتہذیب ،کشمیری تہذیب۔ان تمام تہذیبوں میں جو بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں جوانہیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ ان میں جغرافیائی حدوداہم رول ادا کرتی ہیں۔بنگال ایک ساحلی ریاست ہےاور کشمیرایک زمینی ریاست ہے جس کو ساحل میسرنہیں۔یہی بناوٹی اختلافات جوجسمانی طور پرمختلف ریاستوں میں پائے جاتے ہیں،تہذیبوں کی بنیاد بنتے ہیں اور تہذیب کے پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ان تمام اختلافات کوجغرافیہ کے ماتحت(Physical Geography) میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔اسی سے ہر ملک کی ایک الگ اور منفرد تہذیب وجود میں آتی ہیں۔کشمیری تہذیب کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

شادی بیاہ کی رسومات

انسانی زندگی میں تین سب سے بڑے عمل ہوتے ہیں،جن سے اس کے وجود کا تعین ہوتا ہے ،پیدائش،شادی اور موت۔ان میں سے انسان کے بس میں صرف شادی ہی ہے۔انان نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی مرسکتا ہے۔صرف شادی ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں انسان سوچ وچار کرسکتا ہے اوراپنے شریک حیات کوچن سکتا ہے۔کشمیر میں شادی بیاہ کوایک تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔دولہے ،دولہن کے رشتے دار،عزیز واقارب سب شادی کے دن وہاں جمع ہوتے ہیں۔

کشمیر میں شادی بیاہ کا پورا انتظام گھر میں ہی کیا جاتا ہے۔اس کے لئے کوئی شادی گھر کرائے پرنہیں لیا جاتا۔خاندان کے تمام رشتے داروں اور دوست واحباب کودعوت دی جاتی ہے اور سب مل جل کر ایک ہی گھر میں خوشیاں بانٹتے ہیں۔بارات کا استقبال کرتے ہیں۔عورتیں دوقطاروں میں کھڑی ہو کر کشمیری زبان میں گیت گاتی ہیں۔دلہا اور دلہن کے سر پر پیسے، اخروٹ، بادام ،مٹھائی وغیرہ پھینکے جاتے ہیں۔

جب بارات گھر میں پہنچ جاتی ہے تو ان کو بیٹھک میں بٹھا کر مختلف قسم کے مشروبات دیے جاتے ہیں۔ پھر کھانے کی باری آتی ہے جس میں مختلف قسم کے پکوان پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً روغن جوش، رستہ، کباب، میتھی وغیرہ کھانے سے فارغ ہونے کے فوراً بعد نکاح کا رُخ کیا جاتا ہے۔ کشمیر چونکہ ایک مسلم آبادی والا خطہ ہے اس لیے اسلامی طور طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد ''سلام'' کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ جس میں ساس اپنے داماد سے پیسے بدلتی ہے اور اس کی شال پوشی کرتی ہے۔ عام طور پر دُلہن کو ایک پالکی میں بٹھایا جاتا ہے۔ جس کو چار آدمی کندھوں پر اٹھائے ہوئے لے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پریم ناتھ پردیسی کے افسانے سے ملاحظہ ہو۔

> ''وہ اوپر دیکھتی ہے جہاں دولہن کا سنگار ہوتا ہے اور رنگا رنگ پوشاک میں ملبوس پنڈتانیاں کھڑکیوں میں ایک دوسرے کے اوپر جھکیہوئی دولھا کو دیکھ رہی ہیں۔ اور وہ دن پار کر رہی ہیں جب ان کا دولھا بھی اسی طرح آنگن میں منڈل پر کھڑا تھا اور مسلمان عورتیں ایک کونے میں گا رہی تھی۔ سڑکن وتھرے مشکہ کوفورو عقشقہ بمبورو لیلہ آکھو...... پگلی اب دولہا اور دُلہن کے سر پر پیسے، آنے اور دونیاں پھینکی جائیں گی جتنی ہاتھ آئیں، اٹھانا۔'' ۱۰

کشمیر میں خانہ بدوشی

کشمیر میں معاش کا ایک بہت بڑا ذریعہ مال مویشی ہے۔ یہاں ہر گھر میں گائے، بکری یا بھیڑ ضرور دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان مویشیوں سے اُون اور کھال بھی حاصل کی جاتے ہیں جس کو گرم کپڑے بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان مویشوں سے دودھ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ ان مویشیوں کو پالنے کے لئے ایک خاص طبقہ جو گجر بکروال کے نام سے جانا جاتا ہے، مشہور ہے۔ یہ لوگ موسم گرما میں زمینداروں

کے مویشیوں کو جنگل میں چرانے لے جاتے ہیں اور کئی مہینوں تک وہاں اپنے ڈھوکوں میں رہتے ہیں۔ ڈھوکوں کے مکان جن کو'ٹھارا' کہا جاتا ہے عموماً لکڑی اور مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر ان کا رشتہ پورے سماج سے کٹ جاتا ہے۔ وہاں نہ سڑکیں، نہ ہسپتال، نہ بجلی، نہ اخبار اور نہ کوئی ڈاک خانہ ہوتا ہے۔ ان کے پاس صرف گھی، مکھن اور مکئی کی روٹیاں ہوتی ہیں۔ عورتیں، بچے بزرگ بھی اس خانہ بدوشی کے عمل میں شامل ہوتے ہیں۔ مشکل ترین خارزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ راستے میں کئی دن پڑاؤ ڈالنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچتے ہیں۔ راستے میں کھانے پینے کی بھی دُشواریاں آتی ہیں۔ راستے میں چلتے چلتے کئی بھیڑ بکریاں اپنی جان سے بھی برآور ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان خانہ بدوشوں کو معاشی طور کافی بڑا جھٹکا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد کئی طرح کے خطرات ان کے سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہاں پر کچھ موزی جانور ریچھ، شیر وغیرہ کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ چراہ گاہوں میں بھیڑیے مال مویشوں اور انسان کو اکثر خطرہ پہنچاتے ہیں۔ رات میں جب مال مویشی کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ وہاں بھی جنگلی جانور ان کو مار ڈالتے ہیں۔ کئی مرتبہ تو انسان کے ہونے کے باوجود بھی جنگلی جانور ان مویشوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ کچھ زخمی ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار اپنی جان ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ رات کے اندھیرے سے نمٹنے کی ان کے ہاں الاؤ جلانے کی ایک برسوں پرانی روایت ہے۔ جس سے یہ لوگ اپنے آپ کو ٹھنڈ سے محفوظ رکھتے ہیں اور ارد گرد بیٹھ کر اپنے ہاتھ پاؤں بھی تاپتے جاتے ہیں۔ اسی گجر عوام کی تہذیب کے متعلق سے پشکر ناتھ کے افسانہ ''ٹراوٹ مچھلی'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پہاڑی کے اوپر گھنے جنگلوں کے پرے ایک بڑی چراگاہ ہے۔
> یہاں گوجر لوگ بھیڑ بکریاں اور مویشی لے کر گرمیوں کے مہینے
> گزراتے ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے دور ان لوگوں کی زندگی
> قدرت کے بہت قریب ہوتی ہے۔ دودھ اور مکھن کی بہتات

اور شہد کوئی نئی تہذیب کیروشنی نہیں ۔ کوئی انگریزی یا دیسی اسکول نہیں ۔ کوئی ہسپتال یا ڈاکخانہ نہٰں ، کوئی بینک وغیرہ نہیں صرف چند کٹھار، الاؤ اور مکی کے بٹھے ۔'' ۱۱

رہن سہن

کشمیر میں رہن سہن کا بندبست باقی پورے ملک سے الگ ہے ۔ وہاں پر دو موسم خاص ہرتے ہیں جن کے تحت رہن سہن کا سامان مہیا کیا جاتا ہے ۔ کشمیر میں شہری آبادی کے مقابلے میں پہاڑی علاقوں میں آباد لوگوں کی تعداد لگ بھگ ۸۰ فیصد ہے ۔ اس وجہ سے وہاں کے پہاڑی علاقوں اور شہروں کے رہن سہن میں فرق بھی دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن کئی جگہوں پر یہ اختلافات مٹ جاتے ہیں اور ہر طرف یکسوئی نظر آتی ہے ۔ ایسے میں چلے کلاں خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ چلے کلاں کا موسم ۲۰ دسمبر سے شروع ہوجاتا ہے اور ۳۱ جنوری تک رہتا ہے ۔ اس دوران سورج کا کہیں پر پتہ بھی نہیں ہوتا ۔ ٹھنڈ اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور لوگوں کا گھروں سے نکلنا بھی دشوار ہوجاتا ہے اس موسم میں کانگڑی کا استعمال خاص طور پر کیا جاتا ہے ۔

ٹھنڈ سے نبرد آزما ہونے کے لئے اکثر مکان لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں ۔ صرف چھت ٹین کا ہوتا ہے، جس سے برف آسانی سے چھت سے گر سکے اور مکان کی چھت کو کوئی نقصان نہ پہنچے ۔ موسم سرما میں سردیسے نمٹنے کے لئے خاص طور پر گرم ملبوسات عمل میں لائے جاتے ہیں ۔ جن میں کُرتا پھرن، جیکٹ، کوٹ، پٹو، لوئی وغیرہ کو استعمال میں لایا جاتا ہے ۔ اس دوران موسم گرما میں سوکھائے گئے پھل، سبزیوں وغیرہ کو خاص طور پر استعمال کیا جاتا ہے جن کو وہاں کی مقامی زبان میں ''سنگڑی'' کہا جاتا ہے ۔ جو پھل اور سبزیاں سوکھائی جاتی ہیں ان میں خوبانی، ناشپاتی، ساگ، گوشت کا آچار، لوکی، قدو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ ان تمام کو سردیوں کے موسم میں کھایا جاتا ہے ۔

دیہاتی علاقوں میں مکان کچھ الگ رنگ ڈھنگ سے بنائے جاتے ہیں ۔ خاص کر گجر بکروال

طبقے میں، کچا مکان اوراس کے ساتھ مویشیوں کیلئے ایک الگ کمرہ ہوتا ہےاس کو(گاؤخانہ) گوجری میں باناڑی کہتے ہیں۔اس میں مویشیوں کو باندھا جاتا ہے۔کرشن چندر کے ناولوں میں ہو بہو وہی تصویر ملتی ہے جو وہاں کی حقیقی زندگی میں بھی رائج ہے۔کرشن چندراپنے ناول میں اپنے کرداروں کے ذریعے ایک کسان کے گھر کی حقیقی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میرے پتا جی نے پوچھا۔

'''' کا کاتم نے کسی کسان کا گھر دیکھا ہے''

''نہیں پتا جی''

چلو ہمیں دکھائیں

میں نے ڈولا کا گھر دیکھا۔مٹی کی چار دیواری تھی۔مٹی کی چھت تھی۔جس میں لکڑی کی جھاڑیاں کوٹ کوٹ کر بچھائی گئی تھیں۔ گھر میں کوئی کھڑکی نہ تھی ۔صرف ایک دروازہ تھا۔ ایک اندھیرے کونے میں ایک چولہا تھا۔اس پر نیلے پتھر کا ایک تراشا ہوا ٹکرا اوندھا پڑا تھا۔ جسے پہاڑی میں''تراڑ'' کہتے ہیں۔ میرے پتا جی نے پوچھا وتراڑ کس لئے ہے؟ ڈولا بولا۔یہ تراڑ نہیں ہے تو اہے'' پتھر کا توا؟ میرے پتا جی حیرت سے بولے''ڈولا نے آہستہ سے سر ہلایا۔اس پر روٹی پکا تا ہوں۔اس پر روٹی پک جاتی ہے؟ میرے پتا جی نے پوچھا پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔دیکھا تم نے کسان کا گھر؟'' [۱۲]

یہاں پر اگر کوئی بیمار ہو جائے تو بیمار کو شفا خانے کس طرح لے جایا جاتا ہے کیوں کہ گاؤں میں ہسپتال کی کوئی سہولت نہیں ہوتی تو لوگ مریض کو چار پائی پر شفا خانے لے جاتے ہیں۔ہسپتال یہاں

پر کافی دوری پر واقع ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کی عوام کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مہمان نوازی کے لئے کشمیر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے جس کو جا بجا دیکھا جا سکتا ہے اور مختلف سیاحوں اور ادیبوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وادیٔ کشمیر میں ہر مذہب وملت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ وہاں پر شادی بیاہ یا کوئی مذہبی تہوار ہو مسلمان اور ہندو آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ کچھ سیاسی وجوہات کی بنا پر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں کافی قتل وغارت دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی آپسی محبت خلوص اور ملنساری نے ان کے تعلقات کو بالکل مکمل طور پر خارجنہ ہونے دیا اور یہ آج تک آپس میں بھائی چارگی اور ہمدردی کی مثال قائم کیے ہوئے ہیں۔

کشمیر میں لوگ پیروں فقیروں کی زیارت کو بہت زیادہ مانتے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ جب بھی کسی بزرگ کی زیارت پر جاتے ہیں وہاں دعائیں مانگتے اور اپنی حاجت کے لیے دھاگا باندھتے ہیں تو یقیناً اُن کی حاجت پوری ہوتی ہے اور جب اُن کی حاجت پوری ہو جاتی ہے تو وہ نظرانے کے طور پر زیارت گاہ پر جا کر بکرے، مرغے، وغیرہ ذبح کرتے ہیں اور غریب ومسکین لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حاجت روائی کے لیے اور بھی مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کشمیر میں گلمرگ کے قریب حضرت پیام الدین بابا ریشی کا مقبرہ ہے، وہاں ان کا بنایا ہوا ایک مٹی کا چولہا بھی ہے۔ جہاں لوگ اپنی حاجت روائی کے لیے اس چولہے کی۔۔۔۔۔ بھی کرتے ہیں۔ جس کا ذکر کشمیر کے ایک مشہور افسانہ نگار عمر مجید نے اپنے افسانے میں اس طرح کیا ہے۔

> ''لیکن اولاد کی نعمت سے محروم رہی ماں نے ہر پرتھ استمان، ہر درگاہ میں حاضری دی۔ پھر شیخ پورہ کی سب سے بزرگ عورت خدیجہ ماسی نے حضرت بابا ریشی کے روضہ پر حاضری دینے کو کہا۔ روضہ مبارک پر مٹی کا بنا ہوا ایک چولہا ہے۔ وہاں جا کر

حاجت مند عورتیں چولہے کی ۔۔۔۔۔کرتی ہیں وہم بھی بابا
ریشی کی زیارت گاہ پر گئے۔ہم نے دعا مانگی، میری ماں بہت
روئی، لاجونتی نے چولہے پر لپائی کی اور مقدس دھاگا باندھا اور
ٹھیک ایک سال کے بعد انجلی پیدا ہوئی۔یہ ہے انجلی۔'' ۱۳ؔ

کشمیر کی تہذیب وثقافت میں کشمیر کے اولیاء کا بہت بڑا کردار رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں کشمیر میں ہر جگہ پر تھوڑے فاصلے کے بعد بزرگ حضرات کی درگاہیں نظر آتی ہیں۔کشمیر کے لوگ ان اولیاء کو صدقِ دل سے مانتے بھی ہیں اور صرف مسلم گھرانے کے لوگ ہی نہیں بلکہ ہندو اور سکھ مذہب کے لوگ بھی ان درگاہوں پر جاتے ہیں حاضری پیش کرتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور اپنی حاجت کے لیے دُعا کرتے ہیں۔اسی وجہ سے کشمیر کی تہذیب کو مخلوط تہذیب کہا جاتا ہے۔

کشمیر کی ثقافت میں یہاں کے لباس، زیورات اور رسم ورواج تمام کا ذکر ہوتا ہے۔چونکہ یہاں کی ثقافت میں یہ تمام چیزیں لازم وملزوم ہیں۔کشمیری تہذیب وثقافت میں جو چیز اپنا کلیدی کردار ادا کرتی ہے وہ یہاں کی کانگڑی اور پھرن ہے۔خطۂ کشمیر میں پھرن کے ساتھ کانگڑی کا نام نہ لیا جائے تو یہ ناانصافی ہے۔کانگڑی جو کہ سردی کے موسم میں پھرن کے ساتھ لازم وملزوم سی ہو جاتی ہے۔یہ ایک طرح کا مٹی کا پیالہ ہوتا ہے جس کو چاروں طرف سے بید کی پتلی پتلی تیلیوں سے باندھا جاتا ہے اور مٹی کے پیالے میں آگ ڈال کر پھرن کے اندر رکھنے سے جسم اچھا خاصا گرم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی باقی ریاستوں میں پہنے جانے والے تقریباً تمام ہی ملبوسات ریاست جموں وکشمیر میں پہنے جاتے ہیں۔لیکن کچھ ایسے لباس ہیں جو ہندوستان کی باقی ریاستوں میں نہیں پہنے جاتے۔ پھرن کا ذکر کر دیا ہے اس کے علاوہ یہاں پر پہنے جانے والی ٹوپی بالکل سر کے ساتھ چپکی ہوتی ہے اس کو عموماً کشمیر کی بزرگ خواتین پہنتی ہیں۔ کیوں کہ یہاں پر سردی کثرت سے ہوتی ہے اور سر کو جدید برفانی ہواؤں سے بچایا جانا ضروری ہے۔ یہ ٹوپی عام طور پر کسی موٹے کپڑے کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ گجر قبیلوں میں بھی عورتیں ٹوپی پہنتی ہیں

چاہے گرمی ہو یا سردی ان پر قسم قسم کی رنگینی ہوتی ہے۔ کشمیر میں اس کو مقامی طور پر دستار کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں مسلمان گھرانوں میں عورتیں برقعہ (حجاب) بھی پہنتی ہیں۔ جو کہ کسی سفید یا رنگین کپڑے کا ترکی، عربی یا ایرانی انداز میں بنا ہوا ہوتا ہے۔ مسلمان عورتیں زیادہ تر شلوار قمیض ہی پہنتی ہیں۔

کشمیر میں ہندو مذاہب کی عورتیں شادی سے پہلے تقریباً شلوار قمیض ہی پہنتی ہیں لیکن شادی کے بعد اکثر ساڑی پہننے کا رواج عام ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات بھی جموں وکشمیر کی تہذیب پر برائے راست اثر انداز ہیں۔ کشمیر کے دیگر پہاڑی علاقوں میں مرد کھلے پانچوں والی شلوار اور ڈھیلی ڈھالی قمیض پہنتے ہیں اور اس کے اوپر سردی سے بچنے کے لیے ایک واسکٹ بھی پہنی جاتی ہے۔ واسکٹ زیادہ تر گوجر اور پہاڑی لوگ پہنتے ہیں۔ عورتیں ایک ہی ہاتھ سے بنے ہوئے دھاری دار کپڑے کی تنگ موری والا پاجامہ اور کرتا پہنتی ہیں۔

زیورات

ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح جموں وکشمیر میں بھی زیورات کو کافی اہم مقام حاصل ہے۔ کشمیر میں زیادہ تر زیور سونے کے ہی پسند کیے جاتے ہیں۔ قدیم دور میں چاندی کے زیور بھی پہنے جاتے تھے جن میں کلائی کی چوڑیاں اور کانوں کی بالیوں وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ جموں وکشمیر کی عورتیں زیورات کی بہت شوقین ہیں۔ جس میں وہ مختلف اقسام کے زیور استعمال کرتی ہیں کانوں کے زیور میں بالیاں اور آویزے بہت مشہور ہیں۔ بالیوں کے لیے کشمیری زبان میں ایک لفظ (کنہ واجہ) جس کے لفظی معنی کانوں میں پہنے جانے والی انگوٹھی یعنی سونے یا چاندی کا ایک جوڑا سا کماندار پترا جس کے دونوں نکیلے سروں کو ملا دیا گیا ہو۔ (کنہ واجہ) پر طرح طرح کی مینا کاری کی جاتی ہے اس کی لمبائی تقریباً ڈھائی انچ اور چوڑائی ڈیڑھ انچ تک ہوتی ہے۔ اویزوں کے لیے وہاں کی زبان میں (دور، آلقہ ہور، آتت ہور) وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جموں وکشمیر کی پنڈت عورتیں سہاگ کی نشانی کے طور پر (ویجی ہور) پہنتی ہیں۔ یہ ستارے کی طرح ہوتی ہے جس کی ایک لمبی ڈور کانوں میں لٹکتی رہتی ہے۔ ناک کے زیور

میں خطۂ کشمیر کی عورتیں بہت کم استعمال کرتی ہیں۔ دیگر ہندوسانی ریاستوں کی طرح بڑی سی طلائی یا نقرائی نتھ کا رواج نہیں ہے۔ لہٰذا جموں خطے میں کہیں کہیں ناک میں سونے کا (تیلا) یا (کوکا) ڈالا جاتا ہے۔ یہ بہت مہنگا ہوتا ہے لداخ میں بھی اس کا اتنا رواج نہیں ہے۔اس کے علاوہ گلے کے زیور کے لیے یہاں پر مخصوص نام ہیں جیسے حلقہ بند، تروٹ، پونڈ مال ،اور مال وغیرہ اہم ہیں یہ سونے اور چاندی کے بنے ہوتے ہیں۔ دوسری زبان میں اس کو سونے کا ہار نام دیا جاتا ہے۔

ہاتھ اور کلائی کے زیور ہندوستان کی باقی ریاستوں کی طرح جموں وکشمیر اور خصوصاً پونچھ میں ہاتھ کی انگلیوں کے زیور پہننے کا رواج مرد وزن دنوں میں ہے۔ان میں قسم قسم کے چھلے اور انگوٹیاں وغیرہ ہیں۔ کچھ نگینوں میں قیمتی پتھر لگا کر استعمال کی جاتی ہیں۔عورتوں کے لیے بنائی ہوئی انگوٹیاں زیادہ دلکش ہوتی ہیں۔ان پر جڑے ہوئے نگینے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔مردوں کے لیے انگشتہ یاں زیادہ ٹھوس ہوتی ہیں ان پر بڑے بڑے نگ ہوتے ہیں اس کے علاوہ جموں وکشمیر میں ایک قسم کا چھلا بھی پہنا جاتا ہے۔ جو چاندی یا سونے کا بنا ہوا ہوتا ہے کلائی پر پہنے جانے والے زیورات کے اہم ناموں میں کوردار بنگر ہیں جن کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے لداخ میں بھی زیورات کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔

دنیا کی ہر نئی پرانی تہذیب کی تشکیل جدید چار عناصر ترکیبی سے مل کر ہی ہوئی ہے۔

۱۔ طبعی حالات

۲۔ آلات واوزار

۳۔ نظام فکر واحساس

۴۔ سماجی اقدار

تہذیب میں نہ مشرق ومغرب کی تخصیص ہے اور نہ سرد وگرم علاقوں کی قید۔ چنانچہ کشمیر ہو یا کوئی دیگر ریاست کیونکہ ہر قوم ہر ملک اور ہر ریاست کی اپنی ایک منفرد تہذیب ہوتی ہے مگر کسی بھی ملک کی تہذیب میں ان چار عناصر کا ہونا ضروری ہے ہاں مگر تہذیب میں ان عناصر کی ہیت مختلف ہو یا ایک عنصر

دوسرے سے زیادہ نمایاں ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی تہذیب میں ان چاروں میں سے کوئی عنصر سرے سے ہی موجود نہ ہو۔ ان عناصر کے درمیان ایک نا قابل شکست رشتہ ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے رہتے ہیں۔

تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں طبعی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یعنی ہر تہذیب کا اپنا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی مخصوص جغرافیہ کشمیر کا بھی ہے۔ کشمیر کے خوبصورت دریا، پہاڑ، جنگل، میدان ،پھل پھول، سبزیاں، چرند پرند، آب و ہوا اور موسم یہ تمام تر چیزیں کشمیر کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتی ہیں اور کشمیر کے حُسن کو اور وہاں کی تہذیب کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

خارجی ماحول کا اگر ذکر کیا جائے تو کشمیریوں کا طرزِ عمل، ذریعہ معاش، رہن سہن، خوراک و پوشاک، مزاج و مذاق، اخلاق و عادات، جذبات و احساسات غرض یہ کہ اس علاقے کے انسانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اور کشمیر کی عادات و اطوار دوسری تہذیبوں سے منفرد نظر آتی ہیں۔

اگر کشمیر کے رہن سہن کے بارے میں ذکر کیا جائے تو کشمیر میں آج سے بیس سال پہلے سفر کرنے کا بہترین ذریعہ 'ٹانگہ' تھا۔ اب چونکہ اس کی جگہ گاڑیوں نے لے لی ہے تاہم آج بھی کہیں کہیں پر اس کا رواج قائم ہے۔ اور باہر سے آئے سیاح لوگ آج بھی بڑی خوشی سے ٹانگہ سواری کو پسند کرتے ہیں اور گھوڑ سواری کو بھی کیونکہ یہ کشمیر کی تہذیب کا حصّہ ہے اور پہاڑی علاقوں میں آج بھی اگر پہلگام یا پھر یوس مرگ گُلمرگ کی سیر کو جاتے ہیں تو وہاں یہ سواری دیکھنے کو ملتی ہیں اور ان کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کیونکہ پہاڑی پر گاڑی کا جانا دشوار ہے تو اسلئے سیاح یا پھر جو یاتری امرناتھ کی یاترا کو جاتے ہیں اُن کو بھی 'ٹانگہ' یا پھر گھوڑ سواری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

حمام

کشمیر کی تہذیب میں حمام کا ذکر بھی بہت اہم ہے کیونکہ کشمیر کے علاوہ کہیں بھی حمام کا استعمال ان معنوں میں نہیں کیا جاتا جس کا ذکر میں کرنے جا رہا ہوں۔ حقیقت میں حمام ایک کمرے کی مانند ہوتا

ہے اور یہ زمین دوز ہوتا ہے۔ گھر میں یا مسجد میں ایک کمرہ مخصوص کہا جاتا ہے جو نیچے کی طرف سے خالی رکھا جاتا ہے اور اُوپر اُس کے بڑی بڑی پتھر کی سیلے لگائی جاتی ہیں اور سردیوں میں اس کے نیچے بہت ساری لکڑیاں جلائی جاتی ہیں اور اُن کی تپش سے وہ سیلیں گرم ہو جاتی ہیں اور پھر اُس پر بیٹھ کر سردی سے چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔

سماوار:

کشمیری تہذیب وثقافت کا قیمتی ورثہ ’سماوار‘ بھی ہے۔ کشمیری کاریگری کا یہ ایک بڑا نمونہ ہے۔ کشمیر کے لوگ چائے، قہوہ اسی میں بناتے ہیں۔ اس میں چائے کافی دیر تک گرم بھی رہتی ہے اور لذیز بھی ہوتی ہے۔ اس میں نیچے کی تہہ میں کوئلہ ڈالا جاتا ہے اور اوپر کی تہہ میں چائے ڈالی جاتی ہے اور اس وجہ سے وہ کافی گرم بھی رہتی ہے، مگر اب اس کی جگہ کیٹل نے لے لی ہے۔ اس کا رواج بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مگر ابھی بھی کشمیر کی تہذیب میں سماوار کا اہم رول ہے۔ اور لوگ اس کو اپنے گھروں میں ورثے کی طرح سجاتے رکھتے ہیں۔

لانگری

یہ پتھر کی بنی ہوئی ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس میں لاسن و پیاز یا پھر دیگر قسم کے مختلف مثالیں اس میں کوٹ کر تیار کیے جاتے ہیں۔ لانگڑی بنانے کا پتھر سرینگر کے اعتراف میں ہے وہاں ایک جگہ ہے جو اس پتھر کی وجہ سے مشہور ہے اُس جگہ کا نام پینتھہ چوک ہے اس جگہ سے پتھروں کو توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اور پھر اُن کو اچھے طریقے سے تراش خراش کر (لانگری) تیار کی جاتی ہے اور اس کا بھی کشمیری تہذیب سے کافی اہم ناطہ ہے مگر اب آہستہ آہستہ یہ تہذیب بھی مٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے کیونکہ اس کی جگہ اب تابنے اور لکڑی کی لانگری نے لے لی ہے۔ مگر ابھی بھی کشمیر میں ہمیں یہ ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

دریا جہلم بھی کشمیر کی تہذیب کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہ بہت بڑا دریا ہے۔۔ دریا جہلم ویری ناگ

سے نکلتا ہے اور پھر پوری وادی کو سیراب کرتے ہوئے بارہمولہ کے راستے سے پاکستان کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمیر میں اس دریا سے بہت سارے لوگوں کا ذریعہ معاش جُڑا ہوا ہے مگر ان میں ایک مخصوص طبقہ شامل ہے جو بالکل ہی اسی دریا کے ذریعے اپنی روزی روٹی کا اہتمام کرتا ہے۔ اُس کنُبے کو ہانجی طبقہ کہتے ہیں۔ ہانجی خاندان ایک غریب خاندان ہے جو اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیار کرتے ہیں اور اُس کے بعد دریا جہلم سے مچھلیاں، پکڑ کر اُن کو فروخت کر کے اپنا گزر بسر کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی کفالت کرتے ہیں۔ صرف مچھلیوں پر ہی منحصر نہیں رہتے بلکہ یہ بہت ساری اقسام کی چیزیں دریا جہلم سے نکالتے ہیں جن میں (ندرو) کافی اہم ہے اُس کے علاوہ مختلف قسم کی دالیں بھی ہوتی ہیں اور جب یہ تمام چیزیں دستیاب نہ ہوں تو یہ دریائے جہلم سے ریت یا بجری نکال کر اُسے فروخت کر کے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

چنار

چنار کا درخت کشمیر کی تہذیب وثقافت کا ایک اہم حصّہ ہے۔ وادی کشمیر کی خوبصورتی میں یوں تو ہر قسم کے چھوٹے بڑے درخت اپنا ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن چنار اپنی قد وقامت اور حسن کی وجہ سے ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ چنار اگرچہ ایک غیر ثمر دار درخت ہے۔ مگر اس کی لکڑی جو ہر دار ہوتی ہے، شدید گرمی میں اس کا سایہ فرحت بخش ہوتا ہے۔ جبکہ تیز بارش میں یہ اپنے سایہ تلے دس منٹ تک بھیگنے نہیں دیتا ہے۔ اس درخت کی لمبائی ۲۵ میٹر اور موٹائی ۵۰ فٹ سے بھی زائد ہوتی ہے۔ موسم گرما کے دوران جہاں اس کے بڑے بڑے سر سبز پتے، خوشنما نظر آتے ہیں۔ وہیں خزاں کے موسم میں پتے سرخ رنگ میں تبدیل ہو کر ایک الگ ہی حسن بکھیرتے ہیں۔

کشمیری میں چنار کو 'بون' کہا جاتا ہے۔ جبکہ شاہی درخت کے نام سے بھی یہ اپنی شناخت رکھتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں پہلی مرتبہ چنار کا درخت مغلوں کے دور اقتدار میں سنہ ۱۵۸۶ء کے بعد سرزمین فارس سے لا کر بویا گیا۔ لیکن بعض محققین کہتے ہیں کہ کشمیر میں سب سے پرانا چنار ۱۳۷۴

میں لگایا گیا۔شاعر اور ثقافتی مبصر ’ظریف احمد ظریف‘ کہتے ہیں کہ چنار کشمیر کا اپنا درخت ہے، کیونکہ اس کا ذکر شیخ العالم شیخ نورالدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ اور چودھویں صدی کی معروف شاعرہ لل دید نے بھی اپنے کلام میں کیا ہے۔

چنار کو میجک آف کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔رات کے وقت جب چنار کے پتوں پر روشنی پڑتی ہیں تو سلگتے ہوئے پتے ایک حسین امتزاج پیدا کرتے ہیں۔جس سے فطرت کے شیدائی دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔چنار کے پودے کو تناور، جلالی اور سجاوٹی درخت بننے میں ایک صدی لگ جاتی ہے۔چنار نے اپنی منفرد پہچان اور خوبصورتی کی بدولت یہاں کے ادب اور شعروشاعری میں بھی اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔اس لیے شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال نے کشمیری لوگوں کو چنار کے درخت کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا ہے کہ:

جس خاک کے خمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

ہر تہذیب کا مخصوص نظام فکر واحساس ہوتا ہے یہ نظام اس رشتے کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے جو معاشرے کے افراد اور موجودات میں استوار ہوتا ہے۔چنانچہ انسان کے حالات وجود میں جس سطح پر ہوں گئے اس کے شعور کی سطح بھی وہی ہوگی۔کشمیر کے دوردراز پہاڑی علاقوں میں کاشت کاری کا جو نظام ہے وہ آج بھی وہی پُرانا رواج رائج ہے۔زمین کو جوتنے کے لئے ہل اور بیل کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس طریقے سے فصل بوئی جاتی ہے۔یہ بھی وہاں کی تہذیب کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔

وادیِ کشمیر ریاست جموں وکشمیر کی وہ وادی ہے جو اپنی قدرتی مناظر اور خوبصورتی سے مالا مال ہے جو ہر سال دُنیا بھر کے مختلف ممالک کے لاکھوں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔اور دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں ہر سال سیاح وادی کشمیر کی سیروسیاحت کو آتے ہیں۔اس کے سدا بہار گھنے جنگل، میٹھے پانی کے چشمے، بہتے دریا، نیلی چراگاہیں اور برف کی سفید چادر سے ڈھکی پہاڑوں کی اونچی چوٹیاں،

جھیلیں اور جھرنے دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی کی مثال آپ ہیں۔

بارہویں صدی عیسوی کے مشہور لکھاری کلہانہ نے اپنی مشہور تاریخی کتاب راج ترنگنی میں وادی کشمیر کی خوبصورتی کے بارے میں لکھا ہے کہ کیلاش پہاڑ دنیا کی سب سے خوبصورت جگہ ہے اور ہمالیہ پہاڑ کیلاش کا ایک حصّہ ہے اور وادی کشمیر ہمالیہ کی سب سے خوبصورت وادی ہے۔ کلہانہ کے علاوہ بھی مختلف زبان کے کافی ادیبوں نے کشمیر کی خوبصورتی کو اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کشمیر کو اشیاء کا سوئیزرلینڈ کہا جاتا ہے۔

یہاں پر وادی کشمیر کے چند خاص سیاحتی مقامات کا احاطہ پیش کیا جاتا ہے۔

سرینگر کے تاریخی مقامات

وادی کشمیر کی سب سے مشہور جگہ سرینگر ہے۔ سرینگر کو وادی کا دل کہا جاتا ہے۔ سرینگر کو Venice of East اور Nucleus of kashmir بھی کہا جاتا ہے۔ سرینگر میں بہت سارے سیاحتی مقامات پائے جاتے ہیں۔ جن میں جھیل ڈل سب سے اہم ہے۔ جھیل ڈل شہر سرینگر کے بالکل متوسط میں پایا جاتا ہے۔ اس کا کل رقبہ 11.20 کلومیٹر ہے۔ جھیل ڈل دنیا بھر میں خوبصورت شکارہ اور ہاؤس بوٹ کے لیے جانا جاتا ہے۔

۱۔ نگین جھیل

نگین جھیل سرینگر میں ہی پائی جاتی ہے۔ یہ بھی اپنے خوبصورت ہاؤس بوٹ کے لیے جانا جاتا ہے۔ ہاؤس بوٹ اور شکارہ کشمیری تہذیب کا خاص حصّہ بن چکے ہیں۔

۲۔ شالیمار باغ

خوبصورت شالیمار باغ مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی بیوی نور جہاں کے لئے بنوایا تھا۔ یہ باغ ۱۸۲ میٹر رقبہ پر مشتمل ہے۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک نہر گزرتی ہے جو کہ اس کے حُسن کو مزید دوبالا کرتی

ہے۔

۳۔سراج باغ یا تولیپ باغ:

تولیپ باغ پھولوں کی سب سے زیادہ اقسام کی وجہ سے اشیاء کا نمبر ایک باغ ہے۔ یہ باغ سال میں صرف ایک ماہ کے لیے سیاحوں کے لیے کھولا جاتا ہے۔اس باغ کو دیکھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ مختلف علاقوں سے آتے ہیں۔

۴۔چشمہ شاہی

چشمہ شاہی کو بادشاہ شاہ جہاں نے ۱۶۳۲ء میں بنوایا تھا۔ یہ چشمہ اپنے میٹھے اور صاف پانی کے لیے مشہور ہے۔اس کے دائیں طرف ایک باغ بھی ہے جس میں مختلف قسم کے پھول اور پھل اور چنار کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔

۵۔نشاط باغ

نشاط باغ ۱۶۳۳ء میں ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف خان نے بنوایا تھا۔ یہ ڈل جھیل کے بالکل بغل میں بنوایا گیا ہے۔نشاط باغ اور جھیل ڈل دونوں سرینگر کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔

۶۔پری محل

پری محل چشمہ شاہی سے دو کلومیٹر اوپر پہاڑی کی جانب پایا جاتا ہے۔ یہ بادشاہ شکوہ نے بنوایا تھا۔اس محل کے بالکل سامنے ایک باغ بھی بنوایا گیا ہے جب سے اس کی خوبصورتی مزید دوبالا ہوگی ہے۔اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہتا ہے۔

۷۔ہرون باغ

ہرون باغ ایک خوبصورت علاقہ ہے جس میں بہت سارے چنار کے درخت اور پھول پائے جاتے ہیں۔اس کے درمیان سے ایک نہر نکلتی ہے۔ یہ منظر بھی دل کو موہ لینے والا ہے۔ یہ جگہ نزدیکی

مقامات کے لوگوں کی سیاروسیاحت کے لئے خاص توجہ کا مرکز رہتا ہے۔

۸۔حضرت بل

وادی کشمیر کی مشہور اور خوبصورت زیارت حضرت بل سرینگر شہر میں پائی جاتی ہے۔ یہ زیارت مختلف ناموں سے مشہور ہے جیسے حضرت بل، آثار شریف، درگاہ شریف اور درگاہ وغیرہ۔ یہاں پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی زیارت بھی ہیں۔ الوداع جمعہ، ربیع اول اور دوسرے بڑی اسلامی دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کا دیدار کروایا جاتا ہے۔ زیارت کی سنگ مرمر عمارت کی تعمیر اسلامی اوقاف کمیٹی نے شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں ۱۹۶۸ء میں شروع کی اور ۱۹۷۹ء میں تعمیر کا یہ کام مکمل ہوا۔

۹۔جامع مسجد سرینگر

جامع مسجد سرینگر پرانے شہر کی بالکل متوسط میں واقع ہے۔ یہ مسجد تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں نمازی جمع ادا کرتے ہیں۔ جموں کشمیر کی یہ سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ سلطان سکندر نے ۱۶۰۰ء میں سنوائی شروع کرائی تھی مگر سلطان کے بیٹے زین العابدین نے اس کی تعمیر کا کام مکمل کروایا۔

۱۰۔شنکراچاریہ مندر

سرینگر سے ۱۰۰۰ افٹ کی دوری پر تخت سلیمانی کی پہاڑی کے بغل میں بنوایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرو شنکراچاریہ اس جگہ رُکے تھے اور انکی یادہ میں یہ مندر اشوکھا راجہ کے بیٹے جلوکا نے بنوایا تھا اور اس کے بعد دوبارہ راجہ گوپادتیہ نے مرمت کروا کر اس کو پھر سے تعمیر کروادیا۔

۱۱۔خانقاہ معلیٰ

زیارتِ شاہ ہمدان وادی کی قدیم زیارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ سرینگر کے پرانے شہر دریائے

جہلم کے کنارے پر واقع ہے۔ زیارت سلطان سکندر نے اُس وقت کے مشہور صوفی میر سید علی ہمدانی کی یاد میں بنوائی تھی۔ میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ سب سے پہلے کشمیر آتے تھے اور تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا تھا۔

۱۲۔ پہلگام

پہلگام گاؤں وادی کشمیر میں جنت بے نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دریائے لیدر کے کنارے پر پایا جاتا ہے۔ یہ قدرتی مناظر نیلی چراگاہوں اور میٹھے چشموں کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور ہے۔ امرناتھ یاترا کرنے والوں کے لیے سب سے پہلی جگہ یہی آتی ہے۔

پہلگام کے دوسرے سیاحتی مقامات میں سے مشہور پہاڑی اسٹیشن ہے جو بے شمار سیاحتی لوگوں کی اپنی طرف کھینچتا ہے۔ برفانی جھیلیں، ایک شاندار دریا اور پرسکون وادیوں کے مناظر دل کوموہ لیتے ہیں۔ اوورا وائلڈ لائف سینچری دریائے لیدر Lidder river کے اوپری کنارے پر واقع ہے جس میں مختلف اقسام کے جانور جیسے کہ کشمیری ہرن، برفانی چیتا، بھورا ریچھ، اور کستوری ہرن پائے جاتے ہیں۔

پہلگام کے بالائی علاقے میں شیش ناگ جھیل ہے۔ جو کہ برف پوش پہاڑوں کے انتہائی درمیان ۱۱،۷۷۰ فٹ کی بلندی پر جانی جاتی ہے۔ اس سے بھی بلندی پر واقع ایک اور جھیل ٹولیان ہے۔ جو کہ ۱۲۰۰۰ء فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پہلگام میں ایک اور خوبصورت جگہ لیدر امیوزمنٹ پارک ہے۔ یہ بھی دریائے لیدر کے اوپری کنارے کی طرف واقع ہے۔ اس طرح سے پہلگام بھی وادی کشمیر کے دوسرے سیاحتی مقامات کی طرح اپنی مثال آپ ہے۔

۱۳۔ پام پور

ضلع پلوامہ کا یہ قصبہ نہ صرف ہندوستانی بلکہ دنیا کے کافی سارے ممالک میں اپنی زعفران کی کاشت کاری کی وجہ سے مشہور ہے۔

کشمیر میں اسلامی فتوحات اور اسلامی کلچر کا فروغ

ہندوستان میں مسلمان ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ایران اور افریقہ بلکہ یورپ تک میں بھی اپنی عالمگیری فتوحات کا سکہ بٹھاتے گئے۔ چین میں اسلام عربی تاجروں اور سیاحوں کے ذریعہ اس خاموشی کے ساتھ پھیلا کہ آج وہاں مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ تک بیان کی جاتی ہے۔

لیکن کشمیر میں جو مسلمان سب سے پہلے داخل ہوا اس کی شان اور اس کی آمد بالکل نرالی تھی۔ وہ نہ تاجر تھا نہ سیاح، نہ سپاہی نہ سپاہی زادہ بلکہ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھا اس بزرگ کا نام سیّد عبدالرحمٰن عرف بلبل شاہ یا شاہ بلاول تھا جنھوں نے کشمیر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے عام آدمی نہیں بلکہ بادشاہ وقت یونی رینجن شاہ والیٔ کشمیر کو اسلام کے حلقہ بگوشوں میں داخل کرلیا۔ چنانچہ بلبل شاہ کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

بات میں دم لے ٹھہر اے موجہ آب رواں
تھا لب ساحل وہ جب محو عبادت یاد ہے
اے ہری پربت چوٹی اے دُلرائے ڈل کی موج
کی جو غاروں مرغزاروں میں ریاضت یاد ہے
اے ذتستہ اے ندی امرت کی اے آب حیات
وہ قیام شاہ بلبل خضر صورت یا د ہے

بُلبل اسلام جب آیا ترے گلزار میں

اے گل کشمیر کیا وہ دن وہ ساعت یاد ہے
دیکھنا شاہی محل سے راجۂ ذی جاہ کا
گھر بلا کر پھر تجھے دینا وہ دعوت یاد ہے
مسلم بیکس سے ملنا وہ شہ کشمیر کا
کفر اسلام سے صاحب سامت یاد ہے

صفحہ دل سے مٹا دینا وہ نقش کفرو شرک
سیکھنا اسلام کی طرز عبادت یاد ہے
اِک بدیسی سے کیا تھا جس محبت کا سلوک
اے ریچن شاہ وہ اب تک محبت یاد ہے
کلمۂ توحید پڑھ لینا وہ دل کے شوق سے
وہ دست شاہ بلبل پروہ بیعت یاد ہے

جنت الدنیا میں اول تو ہی نو مسلم ہوا
رفتہ رفتہ ہوگئی تیری رغبت یاد ہے
آگیا اسلام کے قبضہ میں آخر تخت بھی
اکثریت پر یہ وحدت کی حکومت یاد ہے

سیدعبدالرحمٰن صاحب کے بعد حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی عرف شاہ ہمدان ان کے صاحبزادے میر محمد ہمدانی اور بہت سے سادات اعلیٰ درجات کشمیر میں آئے۔ شیخ نورالدین ولی اوران کے خلفائے عظام۔ حضرت مخدوم شیخ حمزہ اوران کے برگزیدہ نام لیوا اور شیخ بہاؤالدین گنج بخش اور کئی

بزرگ خاک کشمیر نے پیدا کیے۔ جن کی بابرکت صحبتوں جن کے علم وعمل جن کے اخلاق فاضلہ جن کے اتقاء وزہد اور جن کے موعظہ حسنہ نے اس ملک میں جہاں کسی ایک مسلمان کی شکل بھی نظر نہ آتی تھی۔ لاکھوں کی تعداد پیدا کردی۔ بلکہ پانچ سو سال تک مسلمان وہاں حکمران بھی رہے۔

اسلام کو کشمیر میں داخل ہوئے آج تقریباً سوا چھ سو سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں تقریباً پانچ سو سال تک کشمیر میں اسلامی حکومت رہی ہے۔

سادات

کشمیر میں اسلام کی بنا سادات ہی نے ڈالی ہے۔ سب سے پہلے حضرت بابا بلبل شاہ کہ بعض تاریخوں میں شاہ بلبل اور شاہ بلاول بھی ان کو لکھا گیا ہے۔ کشمیر میں اشاعت اسلام کی غرض سے آئے۔ کشمیر میں سب سے پہلی مسجد آپ ہی نے تعمیر کرائی جو عرصہ تک ضبط سرکار رہنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں واگزار ہوئی ہے محلّہ بلبل لنگر میں آپ کا مزار ہے۔

آپ کے بعد دوسرے بزرگ سید جو کشمیر میں وارد ہوئے۔ وہ سید حسین سمنانی تھے جن کا مزار کولگام میں مرجع خلائق ہے۔ آپ کے قرابت دار سادات کی ایک معقول جماعت تھی لیکن سب سے بڑی تعداد سادات کرام کی حضرت امیر کبیر سید علی ثانی عرف حضر شاہ ہمدان کے ساتھ بعہد سلطان قطب الدین ۷۸۱ھ میں وارد کشمیر ہوئی۔ ہمدان دسمنان کے علاوہ کشمیر میں ممالک ذیل کے سادات بھی تشریف لائے اور وہ کشمیر ہی کی خاک میں مل گئے۔

سادات جو ابتدا میں صرف صوفی منش تھے اور عبادت و ریاضت اور درس و تدریس کے سوا سیاسی امور میں کوءحصہ نہ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حکومت کے معاملات میں دخل دینے لگے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر پیری مریدی کا کام کرتے ہیں کئی ایک جاگیردار اور درباری ہیں سرکاری ملازمتوں میں بھی اسسٹنٹ گورنری۔ ڈپٹی کمشنری، ہائی کورٹ کی ججی اور منسٹری وغیرہ تک پہنچے ہیں۔ جو دیہات میں ہیں وہ زراعتی زندگی بسر کرتے ہیں۔

کشمیری پنڈت اوران کی ذاتیں اور گوتیں

جن لوگوں نے راج ترنگنی کا مطالعہ کیا ہے انہیں اس بات کوتسلیم کر لینے میں تامل نہ ہوگا کہ مذہب اسلام اختیار کرنے سے قبل کشمیر کے ہندوسب کے برہمن ہی نہیں تھے۔ نیلہ مت پوران اور راج تنگنی میں اس زمانہ کے حالات درج ہیں جب کہ ابھی دنیا میں فن تاریخی نویسی جاری بھی نہیں ہوا تھا۔

لکھا ہے کہ اس زمانہ میں وادیِ کشمیر ایک بہت بڑی پہاڑی جھیل تھی اور اس کا نام ستی سر تھا۔ کیشپ رشی نے جھیل کا پانی نکال کر اسے خشک کیا اور برہمنوں کو لاکر آباد کیا برہمن گرمی کے ایام یہاں گزار کر سردی کے دنوں میں واپس چلے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں یہاں ایک قبیلہ پشاچ اور یاکش کے نام سے آباد تھا۔ یہ قبیلہ برہمنوں کے برعکس ایام سرما یہاں گزارتا اور گرمی کے ایام میں تبت چلا جایا کرتا تھا نیل ناگ مصنف نیلہ مت پوران کے مشورہ سے جو ناگون کے قبیلہ کا سردار تھا۔ برہمنوں ن یاکشوں کو جو یہاں کے اصلی باشندے کہلاتے تھے۔ اس خیال سے کچھ تحائف دینے شروع کیے۔ کہ وہ ان کو تنگ نہ کیا کریں۔ چنانچہ ابھی تک کہ اس واقعہ کو کئی ہزار سال گزر چکے ہیں۔ ہر سال پندرھویں پوس کی اندھیری رات کو کھچڑی ماوس کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو ہر کشمیری پنڈت کے گھر میں کھچڑی پکتی اور کوری ہنڈیا میں ڈال کر یاکشوں کے نذرانہ کے طور پر کہیں رکھ دی جاتی ہے۔

یاکشوں کے متعلق روایت ہے کہ وہ پست قامت مگر جسم کے مضبوط مگر جسم کے مضبوط اور طاقتور ہوتے تھے اور سر پر ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اقوام ڈارنا نک اور تانترے کا ذکر نیلہ مت پوران اور راج ترنگنی میں ہے۔

کشمیریوں کے عادات وخصائل اور ان کے دھرم کرم کے متعلق سب سے پرانی کتاب نیلہ مت پوران ہے اس کے بعد راج ترنگنی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں مندرجہ ذیل قوموں کے نام خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔ میچھ ،نشد ، بھٹ ، رکھش ، ایکنگ ، ڈامر (ڈار) تانترے۔ نیائک ۔ یہ قومیں نہ صرف ملک کے تاجداروں کو تکلیف دیا کرتی تھیں بلکہ برہمنوں کو بھی ستایا کرتی تھیں۔ یہ اقوام کھیتی باڑی

فوجی ملازمت اور اسی طرح کے دوسرے کام کیا کرتی تھیں۔ کشمیر کی زراعت پیشہ آبادی میں اب بھی تانترے۔ نیائک اور ڈار (اختصار ڈامر) ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔

کشمیری برہمن یہاں کے اصل باشندے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے آئے تھے۔ وہ صرف برہمن ہی نہیں تھے بلکہ مختلف اقوام میں سے تھے۔ ان میں سے کئی لوگ حصول علم کی خاطر آتے تھے۔ اور کئی بیرونی حملوں کے خوف سے بھاگ کر یہاں آکر پناہ لیتے تھے۔

الغرض کشمیری تہذیب وثقافت کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں یہاں کی تہذیب وثقافت پوری دنیا میں آج بھی اپنی ایک منفرد شناخت اور پہچان رکھتی ہے۔ یہاں کی تہذیب ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بالکل الگ ہے۔ کشمیر میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہ کشمیری ہے جو کسی بھی دوسری ریاست کی زبان سے مماثلت نہیں رکھتی ہے۔ یہان کا رہن سہن، یہاں کا کھان پان، یہاں کی شادی بیاہ کی رسومات، یہاں کے لباس، یہاں کے پکوان اور یہاں کی مہمان نوازی وغیرہ سب اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی تاریخی عمارات اور یہاں کے سیاحتی مقامات بھی پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ گلشن ہند، مرزا علی لطفؔ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۱۲۹

۲۔ اخلاقِ جلالی، جلال الدین دوانی، آگرہ ۱۸۳۹ء، ص ۳۴

۳۔ منقول از دبستان تاریخ اردو، مصنفہ حامد حسن قادری کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۴۴

۴۔ قومی تہذیب کا مسئلہ، ڈاکٹر عابد حسین، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ص ۳۴

۵۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی، عفیف پرنٹرس لال کنواں دہلی، ص ۲۵

۶۔ مولانا آزاد سُبحانی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، اظہر فنر پرنٹرز رضوی لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۸۵

۷۔ کتاب اور تہذیب، ڈاوسن، طبع سائمن اینڈ شوستر ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۵

۸۔ ایضاً

۹۔ فکر و فکشن، ڈاکٹر محمد اقبال لون، میزان پبلشر سرینگر، ص ۴۵

۱۰۔ بہتے چراغ، پریم ناتھ پردیسی، ٹیکہ بٹن بروکار پریس سرینگر کشمیر ۱۹۵۵ء، ص ۱۵۲۔۱۵۱

۱۱۔ کانچ کی دنیا،، پشکر ناتھ، ٹروٹ مچھلی دریا گنج، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۵۲

۱۲۔ میری یادوں کے چنار، کرشن چندر، ایشیا پبلشر دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۴۵۔۴۴

۱۳۔ خوابوں کے اس پار، کرینٹ پبلشنگ ہاؤس جموں، ص ۲۹۔۲۸

باب سوم

نورشاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی

نور شاہ کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی

جموں و کشمیر ہندوستان کی وہ واحد ریاست ہے جو اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی وجہ سے اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ ہندوستانی نقشے کے حساب سے اگر دیکھا جائے تو یہ ریاست ہندوستان کا تاج کہلاتی ہے اور اسی کی وجہ یہ ہے کہ یہ نقشے میں سب اوپر والے حصّے میں ہے۔اس ریاست کی خوبصورتی کا اگر ہم ذکر کریں تو یہ کہنا بالکل دُرست ہوگا کہ Switzerland کے بعد اگر کوئی خوبصورت جگہ دھرتی پر ہے تو وہ کشمیر ہے۔

ریاست جموں و کشمیر دو خطوں میں منقسم ہے اور اس کے دونوں خطے بہت خوبصورت ہیں۔مگر جو خوبصورتی خطہ کشمیر کے حصّے میں آتی ہے وہ دوسرے حصّے میں نہیں ہے۔وادی کشمیر قراقرم اور پیر پنچال کے درمیان میں ایک وادی ہے۔ یہ وادی چاروں طرف سے خوبصورت برفیلے پہاڑوں نے اپنی آغوش میں لی ہوئی ہے۔ریاست جموں و کشمیر خوبصورتی کے حساب سے پورے ہندوستان میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔اس ریاست کی خوبصورتی کی خاص وجہ یہاں کا موسم یہاں کے برفیلے پہاڑ اور باغات ہیں۔

موسمی لحاظ سے یہاں کی آب و ہوا ایسی ہے کہ یہاں پر وہ تمام میوہ جات اور خوبصورت پھل اور پھول اُگتے ہیں اور یہاں کی زرخیز زمین سے زعفران جیسی قیمتی پیداوار اُگتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس وادی کشمیر کو جنتِ بے نظیر بھی کہا جاتا ہے۔

کشمیر کی خوبصورتی کے متعلق رسول پونیر لکھتے ہیں کہ:

> ’’جغرافیائی حالات کسی بھی ملک کی تاریخ پر اثرانداز رہے ہیں۔وادی کشمیر کے فلک بوس پہاڑ، آبشاروں، ندیوں، اور آب

وہوا نے یہاں کے لوگوں کی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ سبھی چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں،لیکن وادی کشمیر ہر طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔سربکف برفیلے پہاڑ جواس کی فصیل کی حیثیت سے عظیم نگہباں کا کاسم دیتے آئے ہیں۔ ہماری تمدنی اور تہذیبی زندگی پر بھی باتیں سیلاب اور قحط سالی وغیرہ جیسی آفتیں ہر دور میں اثر انداز ہوئی ہیں۔غور سے دیکھا جائے تو جغرافیہ کو کسی بھی ملک کی تہذیب کے زوال وارتقا میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔جموں وکشمیراورلداخ کی دشوارگزارگھاٹیاں اس ریاست کو میدان حرب ہونے کے ناطے بہت ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ کشمیر سے بین الاقوامی دلچسپیاں اس کی جغرافیہ کی مرہون منت ہیں۔'' [1]

کشمیر حقیقت میں ایسی جگہ ہے کہ جہاں کوئی بھی تخلیق کار اگر جنم لیتا ہے تو کشمیر کی مٹی کی خوشبواور وہاں کی تہذیب کی عکاسی اُس کے رگ و پے میں پائی جاتی ہے اور پڑھنے والے قارئین کو وہ تمام تر چیزیں وہاں کے تخلیق کار کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔یہی بات ہو بہونور شاہ کے افسانوں میں بھی ہمیں دیکھنے کوملتی ہے۔اُن کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کی عکاسی اور ترجمانی واضح انداز میں نظر آتی ہے کہ قاری کواُن افسانوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بذاتِ خود کشمیر کی وادیوں کی سیر کرر ہا ہے۔ اور وہاں کی خوبصورتی سے لُطف اندوز ہورہا ہے۔اس ضمن میں نور شاہ کے افسانے سے ایک تحریر ملاحظہ ہو:

''یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے،سبز ہے۔ یہاں

پھولوں سے جڑی ہوئی جگہیں ہیں، رنگ برنگے پھولوں سے
سجے سنورے تختے ہیں، جس کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں
کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام، یہ
شالیمار، یہ نشاطیے، نورجہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی
کی یادگار یہ ڈل جھیل ہے۔اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی سی کشتیاں
اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاوس بوٹ، یہ لدر نالہ جس کا
پانی پتھروں سے سر پھوڑتا جھاگ بناتا ہوا جاتا ہے۔ یہ کل کل
کرتی ندیاں اور ان کے کنارے بید کے پیڑوں کی قطاریں
، چنار کے پتوں کا لال رنگ کھیتوں میں پکے ہوئے اناج کی
سرخ بالیاں، یہ کشمیر ہے جس کی ہر شے خوبصورت ہے۔'' ۲

ریاست جموں و کشمیر میں افسانے کا آغاز کافی پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ اور بہت سے نامور افسانہ نگاروں نے کشمیر کی تہذیب کے متعلق اور یہاں کے رہن سہن کے بارے میں اپنی تحریروں میں اور افسانوں میں یہاں کے تہذیب وتمدن کی عکاسی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بڑی فنی چابکدستی سے نورشاہ نے یہاں کے سماجی حالات اور یہاں کی تہذیب کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ جب ہم نورشاہ کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ کسی بھی دوسرے کشمیری یا غیر کشمیری افسانہ نگار سے کرتے ہیں جس نے بھی کشمیر پر لکھا ہے تو یہ فرق واضح طور پر نظر آتا ہے کہ کشمیری تہذیب اور یہاں کے تمدن کی جو تصویر نورشاہ نے قارئین کے سامنے لائی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اور اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ نورشاہ نے بچپن ہی سے یہاں کی سرزمین کے ساتھ ایسا ناطہ جوڑ کے رکھا ہوا تھا جس سے اُنہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو الگ نہیں ہونے دیا اور یہی بات ہے جو اُن کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتی ہے۔ چونکہ اور بھی بہت سے نامور ادیب اس دھرتی پر پیدا ہوئے ہیں۔ جن میں حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست آتا ہے۔ حامدی

کاشمیری کے افسانوں میں بھی کشمیر کے حالات اور تہذیب کی عکاسی ملتی ہے لیکن نور شاہ نے جو کرب اور جو درد اپنے افسانوں میں کشمیر کے حوالے سے پیش کیا ہے وہ بہت کم دوسروں کے یہاں ملتا ہے۔نور شاہ نے اپنے ایک افسانوی مجموعے ''کیسا ہے یہ جنون'' میں اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کہانیوں میں کشمیر کے قدرتی مناظر سے اپنی وابستگی کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''دراصل وادی کے جس حصّے میں، میں نے اپنا بچپن گزارا ہے اور جوانی کے ایام جیے ہیں۔وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصّے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے کہنا یہ ہے کہ وادی کے اس حصّے میں میرے احساس جمال کی پرورش ہوئی ہے۔ اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے ۔لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہے''۔ ۳؎

کشمیر کے لوگوں کے درد کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ نور شاہ کے ہر افسانے میں کشمیر کی جھلک نظر آتی ہے اُنہوں نے جگہ جگہ ماحول ،فطرت ،حسن اور کشمیری موسموں، پہاڑوں، درختوں،تہواروں، رسومات،عقائد، پھولوں اور پھلوں کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

نور شاہ کے افسانے ''اندھیرے اُجالے'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں اُنہوں نے کشمیر کی خوبصورتی کی تعریف کی ہے۔

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادی ،سندر، دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں بدل جاتے ہیں ۔ جہاں بارہ مہینے برف کا رواج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے سبز ہے۔ یہاں

پھولوں سے جڑی ہوئی نگیں ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ،
پہلگام یہ شالیمار یہ نشاط ہے اورنور جہاں کے خوابوں کا باغ
،جہانگیر کی جوانی کی یادگار یہ ڈل جھیل ہے۔اس پر چلتی پھرتی
ننھی ننھی سی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاوس بوٹ،
یہ لدر نالہ جس کا پانی پتھروں سے سر پھوڑتا جھاگ بناتا ہوا جاتا
ہے۔ یہ کل کل کرتی ندیاں اوران کے کنارے بید کے پیڑوں
کی قطاریں چنار کے پتوں کا لال رنگ، کھیتوں میں پکتے ہوئے
اناج کی سرخ بالیاں ،یہ کشمیر ہے جس کی ہر شئے خوبصورت
ہے۔'' ۱۴

نورشاہ نے اپنے افسانوں میں جگہ جگہ کشمیر کے حسن کو منظر نگاری کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ نہ صرف کشمیر کا حسن اور یہاں کے قدرتی نظارے کاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں بلکہ یہاں کی تہذیب، لباس اور طرز زندگی بھی لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔نورشاہ نے بھی یہاں کی حسین وادیوں اور خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب وتمدن اور انسانی زندگی کے مسائل کو بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔نورشاہ نے اپنے افسانوں میں جنسیات پر بھی کھل کر بیان کیا ہے جس کی وجہ سے انھیں جدید دور کا منٹو بھی کہا جاتا ہے۔اگرچہ منٹو جیسی بے باکی سے انھوں نے جنسیات پر قلم نہیں اٹھایا لیکن کافی حدتک ان کے افسانوں میں جنسیات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

نورشاہ کے افسانوں میں رومانیت کا اثر بہت زیادہ حدتک نمایاں نظر آتا ہے۔اُن کے تقریباً تمام افسانوی مجموعوں میں جنسی مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔نورشاہ ریاست جموں وکشمیر میں رومانی ادب لکھنے والوں میں پیش پیش رہے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ رومانی افسانہ نگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانوں میں رومانیت کا عکس نظر آتا ہے۔

رومانی طرزِعمل اختیار کرتے ہوئے نورشاہ اپنے افسانوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

''مجھے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میرے افسانوں کے اکثر و بیشتر کردار رومانی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان سے قائم ہے۔ میری کہانیوں میں ہر دم اور ہر آن حسن کی پرچھائیاں منڈلاتی نظر آتی ہیں۔ شاید میں بہت زیادہ حسن پرست ہوں اور شاید اسی لئے حسین جلوؤں اور منظروں کو اپنے قلم کے کیمرے میں اتار کر اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کی حسن پرستی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہوں۔'' ۵

نورشاہ کی تخلیقی ذہانت جب کہانی میں سرایت کرتی ہے تو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھی بڑی باریک اور فلسفیانہ باتیں سامنے آتی ہیں۔ نورشاہ کی کہانیوں میں جہاں انسان کے نفسی وجنسی مسائل ملتے ہیں وہیں انسانی زندگی کے بے شمار مسائل بھی در آتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو زندگی کے احساس سے پوری طرح جوڑ دیتے ہیں۔

نورشاہ ایک عرصہ تک فطرت پسندی، حسن پسندی اور معاملات حسن و عشق کی طرف مائل رہے۔ لیکن جب ہم ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ جسم و جان کے رومانی اسرار میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کا ایک افسانہ (بے معنی سفر) جس میں وہ رومانیت پسند نظر آتے ہیں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ اور اس چہرے

پرنکھرا سرخ وسفید رنگ، نمکین چائے کے رنگ کی شلوار اور اسی
رنگ کی چست قمیض جسم کا ایک ایک انگ، ایک ایک قوس عیاں
دو موٹی موٹی گولائیاں کے درمیان پسینے کے ننھے ننھے قطروں
سے ابھرنے والی دھیمی دھیمی خوشبو۔ جی چاہتا ہے کہ ان قطروں
کو گھول کر پی لیا جائے، یا ان کا عطر بنا کر جسم پر مل لیا جائے''۔

۶ے

نورشاہ کے افسانے رومانیت اور جدیدیت کے زیر اثر لکھیں گئے ہیں اس لئے ان کے کردار رومانی ہیں ۔رومانیت میں وہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ رومانی حقیقت نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمٰن اعظمی نورشاہ کے افسانوں میں رومانی خصوصیت کے متعلق رقمطراز ہیں:

''نورشاہ کے رومانی کردار اجنبی نہیں۔ ان سے حقیقت کے
مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ حقیقت کی گہرائیوں تک جانا اتنا
آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت ایک شہزادی ہے۔ اس
کے قریب حبشی غلاموں کا ایک دستہ ہے۔ کسی بھی راستے اسے
حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے لیکن محتاط ہوکر، یہ حبشی غلام
نقصان نہیں پہنچاتے ، ہاں ان کے کانوں میں لوہے کی جو
بالیاں ہیں وہ جادو کی ہیں''۔ ۷ے

نورشاہ کی رومانیت جہاں کرداروں میں نمایاں نظر آتی ہے وہیں موضوع اور اسلوب میں بھی نظر آتی ہے۔نورشاہ کی رومانیت ماحول اور فطرت کے باطن میں اُتر جاتی ہے اور پھر کرداروں کے احساس اور جذبے تک پہنچ جاتی ہے۔نورشاہ اپنے افسانوں میں جوانی اور جسم کی رعنائیوں کو اپنے کرداروں کے

ذریعے سے ،اپنے افسانوں میں خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں۔اُن کے ایک افسانے ’’بے بدن‘‘ کاایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’ایک بار پھر کھلی کھلی نظروں سے پھٹی ہوئی جالی کے اندر جھانکنے لگتا ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے اس کے صحت مند جسم کی ساری گرمی میری تشنہ اور دہکتے ہوئے بدن میں اُتر گئی ہو۔اس کے بُرے بُرے لداخی خوبانیاں ،ایسے رس دار ہونٹ میرے خشک ہونٹوں کی تشنگی کو سیراب کررہے ہوں۔‘‘ ۸؎

نورشاہ ایک جدید تخلیق کار ہیں انھوں نے اپنے افسانوں میں موضوع اور کردار کے علاوہ زبان و بیان پر بھی قدرت کا اظہار کیا ہے۔ان کے اسلوب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔وہ بڑی شگفتہ و پرلطف اسلوب سے کام لیتے ہیں۔

اسلوب کی ایک مثال افسانہ ’’رات ایک سمٹی ہوئی‘‘ سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’اس کی ساری خوبصورت لڑکیاں جل پریوں کا لبادہ اُوڑھ کر تلاش میں یہاں چلی آئیں اور میں ان کے تہ دار موجوں کی طرح پھیلتے ہوئے جسموں سے لپٹ لپٹ کر سمٹ جاؤں اور سمٹ سمٹ کر ایک قطرہ بن جاؤں‘‘۔ ۹؎

نورشاہ کے افسانوں میں موضوع ،کردار اور اسلوب کی خصوصیات کے اس سرسری جائزے کہ بعد یہاں ان کے افسانوں میں کشمیری تہذیب کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔نورشاہ نے تقریباً اپنے سارے افسانوں میں کشمیر کی تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔نورشاہ نے اپنے افسانے ’’کیسا ہے یہ جنون‘‘ میں انھیں حالات کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے اور اس میں ایک کمسن لڑکی کے حوالے سے جو مسلہ بیان کیا ہے،اس سے موجودہ دور میں بھی کشمیر اُسی طرح متاثر ہورہا ہے۔اس ضمن میں نورشاہ کے افسانے ’’کیسا ہے یہ جنون‘‘ سے یہ اقتباس

ملاحظہ ہو:

''درد کا کوئی وقت نہیں! میرا نام عامر ہے اور میری عمر لگ بھگ بارہ برس کی ہے۔ بھلا بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے، یہ تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے، زندگی کے طویل سفر میں بارہ برسوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن جب بچپن اور لڑکپن کے مٹھاس بھرے دن تلخیوں اور کڑواہٹوں کے نذر ہو جاتے ہیں۔ کھیل کود کے ایام جدوجہد اور کشمکش کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو ذہن میں اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود کئی سوال ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سارے سوالوں کا میری زندگی سے تعلق ہے سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ آخر میں ہوں کون؟ کس کا بیٹا ہوں، کہاں ہیں میرے ابو؟'' [۱۰]

نورشاہ جن تجربات ومشاہدات سے گزرے ہیں اور جن مسائل کو انھوں نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے ان مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ یہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی ہو بہو تصویریں ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ نورشاہ کے افسانوں کے کردار بھی کشمیری حالات کے پروردہ ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کے دکھ اور بیچارگی اور مایوسی کو افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ لگتا ہے ہم انسانی فطرت اور خارجی واقعات کے ساتھ مکالمہ کر رہے ہیں۔ یہ ہنرمندی اس بات کی دلیل ہے کہ نورشاہ کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ نورشاہ کے افسانے ''کیسا ہے یہ جنون'' سے یہ اقتباس کشمیری تہذیب کے حوالے سے ملاحظہ کریں۔

''جب سے ہوش سنبھالا ہے تو میں نے اپنے آپ کو اپنی ماں یا

اپنی دادی کی گود میں دیکھا ہے، آنکھوں سے آنسوں کے دریا
بہاتے بہاتے بھی وہ میرے لیے ہنستی ہیں، مسکراتی ہیں، ان
کے رخساروں پر رکے آنسو جب میرے چہرے کو چھوتے ہیں تو
میرا سارا جسم لرزلرز سا جاتا ہے، وہ میری ہر بات، ہر چیز، ہر
ضرورت کا خیال رکھتی ہیں تاکہ مجھے اپنی اس مختصر زندگی میں کسی
کمی کا احساس نہ ہو، میری امّی مجھ سے بے انتہا پیار کرتی ہے،
مجھے بے انتہا چاہتی ہے، ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے آپ
سے دور نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس لیے بھی کہ مجھ میں ابّو کی
دوری کا احساس نہ جاگے''۔ [11]

نورشاہ نے کشمیر کے تمدن کو اس افسانے میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک بچّہ اپنے والد کی جُدائی میں تڑپ رہا ہے اور کشمیری عوام پر جتنے بھی مظالم ڈھائے جا رہے ہیں نورشاہ نے اپنے افسانے میں وہ ظلم اس بچّے کے کردار کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں۔ اپنے افسانوں کے ذریعے کہ کس طرح بے دردی سے ایک بچّے کے والد کو اپنے بیٹے سے دور کر دیا جاتا ہے۔ موصوف کے سارے افسانوں میں ہمیں جگہ جگہ پر کشمیری تہذیب، کشمیری تمدن اور کشمیر پر ہو رہے ظلم و ستم اور بربریت کا عکس نظر آتا ہے۔ نورشاہ کی یہ تحریر ملاحظہ کریں۔

''ساجدہ میری زندگی کے اس سفر میں تمہیں کتنے دکھ جھیلنے
پڑ رہے ہیں مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے، اپنی تنہائی کے عالم
میں بھی میرے بیٹے کا کس قدر خیال رکھتی ہو اس حقیقت سے
بھی میں ناآشنا نہیں ہوں، میری ماں بیمار رہتی ہے اس کے
بوڑھاپے کا سہارا بن کر تم مجھ پر جو احسان کر رہی ہو وہ میں

فراموش نہیں کرسکتا......لیکن'' ۱۲

موصوف نے اس بات کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کشمیری سماج میں کچھ عورتیں خاوند کی موجودگی میں بھی بیوہ اور اپنے گھر بار کو اس پریشانی سے دوچار ہوکر اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل اور شب وروز کی سختیاں اور پریشانیاں جھیل کر اپنے دن بسر کرتی ہیں اور خاوند کی موجودگی میں بیوہ ہونے کا مطلب یہ کہ حکومت کی بے توجہی اور ظلم کی وجہ سے کتنے معصوم کشمیریوں کو پکڑ کر جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند کردیا جاتا ہے اور زندگی بھر اُن کی کوئی روداد نہیں سُنی جاتی اور آخر کار ایک دن بنا کسی قصور کے اُن کو تختِ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ آخر کار کتنے ایسے بے سہارا بچّے ہونگے جن کے سروں سے اُن کی شفقت کی چادر چھین لی جاتی ہے اور سایہ پدری سے اُن کو محروم کردیا جاتا ہے یہ بات صرف کسی ایک گھر اور ایک گھرانے کی نہیں ہے بلکہ پورا کشمیر ہی اس درد وکرب میں مبتلا ہے۔

نورشاہ نے بڑے ہی مختصر انداز میں اپنے افسانوں کے ذریعے کشمیر کی پوری تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے کہ اُن کے افسانے افسانچوں کی طرز پر ہیں مگر پُرمغز ہوتے ہیں اُن کے افسانے افسانچوں کی طرز پر ہیں مگر اُن میں پورا سمندر قید کیا ہوتا ہے جیسے کوزے میں سمندر بند کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور یہی ایک بڑے افسانہ نگار کی پہچان بھی ہوتی ہے کہ کس چابک دستی سے وہ بڑی سے بڑی بات بھی چند سطروں میں پیش کردیتا ہے اور یہی خصوصیات ہمیں نورشاہ کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی کتاب فکر وفکشن میں نورشاہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی فن کار اپنے فن سے جنون کی حد تک پیار کرتا ہے تو ایک دن اس کا یہی جنون اسے عالمی شہرت سے ہمکنار کردیتا ہے۔ نورشاہ نے بھی اپنے فن سے جنون کی حد تک پیار کیا اور پھر اسی جنون نے انہیں دنیائے ادب

میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔ یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ
جب ایک فنکار پر جنوجنونی کیفیت طاری ہوجاتی ہے تو اس کے
قلم سے ایسی تخلیق جنم لیتی ہے کہ وہ ادب کا شاہکار بن جاتی
ہے۔'' ۱۳؎

نورشاہ کے زیادہ تر افسانوں میں کشمیری تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اور اُنہوں نے مختلف زاویوں سے اُن کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔نورشاہ کا ایک افسانہ ہے جس کا عنوان ہے''ماں نہیں روئی''اس افسانے میں بھی نورشاہ نے کشمیریوں کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے اور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک ماں کو اپنے لختِ جگر سے جُدا کر دیا جاتا ہے۔

نورشاہ کی یہ تحریر افسانہ''ماں نہیں روئی''سے ملاحظہ فرمائیے:

''رات اُترنے سے ذرا پہلے بندوقوں کی گن گرج میں سمٹنے لگی۔ لگ رہا تھا جیسے ہواؤں نے جھومنا بند کر دیا ہو۔زندگی کی نبض ہمیشہ کے لئے رک گئی ہو۔لیکن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ایک بار پھر گولیوں کی گن گرج سے زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔خوف و وحشت نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔لگتا تھا جیسے خوابوں کے سرسبز شاداب جنگل،صحراؤں میں بدل گئے ہوں اور پھر دیکھتے دیکھتے ایک کہرام سا مچ گیا۔آگ کے شعلے بلند ہوئے اور وہ مکان جس میں وہ تنِ تنہا زندگی کے تمام زائقے ایک ہی بار ایک ہی ساتھ اپنے وجود میں دفن کر چکا تھا جل جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہونے لگا اور جانے انجانے لوگ اپنی اپنی بندوقوں سے اگلنے والی آگ سے پوری

بستی کو خاک کر و خون میں ڈبو کر وہاں سے چل دیئے۔'' ۱۴؎

نورشاہ نے اس تحریر میں یہ بات عیاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بھارتی فوج کی طرف سے نہتے کشمیریوں کے گھروں پر گولا بارُود برسایا جاتا ہے اور ایک تو اُن کی جان لی جاتی ہے اور ساتھ میں جو اُن کی گھر گرستی ہوتی ہے اُس کو بھی کاک کے ملبے میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور یہی بات اُنہوں نے اس افسانے میں بھی پیش کی ہے کہ ایک ماں اپنے لختِ جگر نور نظر سے محروم ہو جاتی ہے مگر ساری دُنیا اُس کی موت پر آہ وزاری اور ماتم کرتی ہے مگر اُس کی ماں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور اُس کی آنکھوں سے صرف آنسوں ہیں نکلتے بلکہ خون کے آنسو بہاتی ہے۔ افسانہ ''ماں نہیں روتی'' سے یہ تحریر ملاحظہ فرمائے:

''اپنے لختِ جگر کا چہرہ آخری بار دیکھنے کے بعد بھی ماں نہیں روئی، بالکل نہیں روتی، اُس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ اور جب میت کو غسل دینے کی نوبت آئی، تو لوگوں کا عظیم اجتماع عیکھ کر ہواؤں نے اپنا رُخ بدل دیا۔ ہر جانب دردو کرب میں ڈوبی ہوئی صدائیں گونج رہی تھی! ''تمہارا بیٹا نہٰں رہا اس دُنیا میں اور تم خاموش ہو!''۔ ''تمہاری کائنات مٹ چکی ہے اور تم خاموش ہو!'' تمہارا اکلوتا کماؤ بیٹا تمہیں اکیلا نہا چھوڑ کر جا رہا ہے اور تم خاموش ہو! جوان بیٹے کا تابوت گھر سے نکلا تب بھی ماں نہیں روئی۔ دفنانے کے بعد جب اپنے پرائے لوٹ کر آئے تو انہوں نے دیکھا ماں اب بھی خاموش ہے، اب بھی اس کی آنکھوں میں کوئی نمی نہیں ہے۔ ''کیسی ماں ہے یہ......؟''

۱۵؎

نورشاہ نے ماں کی بے بسی اور بے کسی کو اس افسانے میں ظاہر کیا ہے کہ کس حد تک وہ ماں لاچار

اور مجبور ہے اور مجسم حیرت بنی ہوئی ہے کہ آخر یہ کیوں کر ہو گیا اور یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ میرا ہر دل عزیز لختِ جگر مجھے یوں کیسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اور آخر اُس کا قصور ہی کیا تھا کیوں اُس کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

نور شاہ کے اس افسانے سے لہو کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کسی بھی تخلیق کار کی کہ اگر وہ کچھ تحریر کر رہا ہے تو اُس کا اثر قارئین پر پڑنا چاہیے اور اُن کو ایسا محسوس ہو کہ تخلیق کار ہم سے براہ راست ہم کلام ہے اور یہی خصوصیات ہمیں نور شاہ کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ جب بھی کوئی قاری اُن کی تحریر پڑھتا ہے تو اُسے یہی محسوس ہوتا ہے کہ مصنف براہ راست ہم سے ہم کلام ہو رہا ہے۔ نور شاہ کی یہ تحریر ملاحظہ کریں افسانہ ماں نہیں روتی:

''لمحے آہستہ آہستہ طویل ہوتے گئے اور پھر وہ دن بھی آیا جب ماں سے ایک مجلس میں شرکت کرنے کے لیے کیا گیا۔ اس کے حق میں معاوضے کے طور پر ایک موٹی رقم منظور کی گئی تھی۔ اس مجلس میں شرکت کرنے کی غرض سے ماں اپنی رضا مندی دے چکی تھی ......آخر رقم بھی اچھی خاصی تھی......دل لبھانے والی...... پانچ لاکھ، ''کیسی ماں ہے یہ......؟'' ۱۶

نور شاہ نے اس افسانے میں تجسس پیدا کرنے کے لیے اور کہانی کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے تھوڑا لمبا کھینچا ہے تاکہ تجسس برقرار رہے اور ماں کے کردار کو الگ رُوپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور سوالیہ طور پر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی ماں ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے لختِ جگر کی موت کے عوض ملنے والی معاوضے کی رقم کھائے اور اُس سے اپنی بھوک مٹائے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کوئی بھی ماں اس حد تک کبھی نہیں جا سکتی۔ نور شاہ کے افسانے ماں نہیں روتی سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایک لفافہ ہاتھ میں لیا اور پرسکون انداز میں کھول بھی دیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں ایک چیک تھا...... پانچ لاکھ کا

چیک...... دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ ہلا ہلا کر چیک کی نمائش کرنے لگی!اب کیا ہوگا؟انسانی رشتوں کی عظمت کا کیا ہوگا!ایک معصوم بے گناہ اور بے قصور بیٹے کے قطرہ قطرہ بوند بوند لہو کی سراہ نیلامی کے بعد کیا ہوگا؟ اچانک اس کی آنکھیں لال ہوگئیں۔اس کے جسم کا سارا خون، بوند بوند خون اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔چیک کو ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہوا میں اُچھال دیا اور خونخوار نظروں سے چیک پیش کرنے والے کی جانب دیکھا، دیکھتی ہی رہی اور پھر اپنی پوری قوت سے اُس کے مُنہ پر تھوک کر اسٹیج سے نیچے چلی آئی۔ ہر جانب خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کے صحرا میں سرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی...... ''نہیں میں ماں ہوں ماں اور میں اپنے بیٹے کے خون کی نیلامی نہیں ہونے دوں گی'' ۱۷ے

نور شاہ نے اپنے اس پورے افسانے میں کشمیر کی تہذیب کو اُجاگر کرتے ہوئے ایک بے بس اور بے کس ماں کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ جہاں پوری انسانیت شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ یہ صرف ایک ماں کی کیفیت نہیں ہے بلکہ ہر روز کشمیر میں کوئی نہ کوئی آئے دن ایسے حادثات ضرور پیش آتے اور مائیں اپنے نور نظروں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں۔

نور شاہ نے اس افسانے میں ایک بچی کی تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے اور کشمیر میں ہو رہے ظلم و جبر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اور اپنے اس افسانے میں پوری کہانی کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

نور شاہ نے اپنے ہر ایک افسانے میں اور اپنی ساری تحریروں میں کشمیر کی تہذیب کی عکاسی کی

ہے اور اُنہوں نے یہ بات اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی کشمیری جو کشمیر میں رہتا ہے اور یہاں کی آب و ہوا میں گل مل جاتا ہے تو اس کے لیے کتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ باہر جا کر کسی جگہ اپنا دل لگائیں اور وہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے ایسا ہی ایک افسانہ ہے نور شاہ کا جس کا عنوان ہے ''بے موسم بادل''۔افسانہ بے موسم بادل کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائے:

> ''یہ میری جھیل ہے...... ڈل جھیل، برف پوش پہاڑوں کی گود میں اپنی وسعتیں لئے اور اس کی سیمی سطح پر سرکتے ہوئے کنول کے پھول اور ان پھولوں کے پتوں پر بکھرتے ہوئے پانی کے لرزاں قطرے۔ان قطروں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے اس انجانے دیش کے اَن دیکھے شہزادے نے زود کے کچے موتی پکنے کے لئے رکھ دئے ہوں۔انجانے دیش کے وہ شہزادہ جو اسی جھیل کے کنارے کسی ایک چنار کے سائے میں پوشیدہ ایک قبر میں کچے موتی پکنے کے انتظار میں صدیوں سے سویا پڑا ہے۔''

۱۸

نور شاہ نے اپنے اس افسانے میں ایک ایسے عاشق کی کہانی پیش کی ہے۔جو کشمیر سے بے حد محبت کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک خوبصورت دوشیزہ سے بھی پیار کرتا ہے جس کا نام زونی ہے۔جھیل ڈل کے ساحل پر اُس کا ایک خوبصورت گھر ہے اُس کے گھر کا نام پمپوش ہے۔نور شاہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں: افسانہ ''بے موسم بادل'' سے:

> ''ڈل جھیل...... میں اسی ڈل جھیل کا باسی ہوں۔یوں تو میرا نام سلطان ہے۔لیکن میں پمپوش کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ کون سلیمان کے دامن میں لمبی اور طویل سڑک کے ساتھ ڈل

جھیل کے وسیع سینے پر ہاوس بوٹوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔
ان ہاوس بوٹوں میں دشیں دشیں اور بھانت بھانت کے لوگوں کی
کہانیاں بکھری پڑی ہیں جو سفید رنگ کا خستہ صورت ہاوس بوٹ
نظر آتا ہے جس کے ایک کونے پر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں
ہے اور جس پر لکھا ہے...... پمپوش ہاوس بوٹ میرا ہے۔ یہ نام
میرے بابا نے رکھا ہے۔'' 19

نورشاہ نے ڈل جھیل میں چلنے والی کشتیوں اور ہاوس بوٹوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بات واضع کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب بھی کوئی سیاح سیر و تفریح کے لیے کشمیر آتا ہے تو وہ ان مقام کی سیر ضرور کرتا ہے اور خاص کر ڈل جھیل کے ہاوس بوٹ میں رات ضرور گزارتا ہے ایسا ہی ایک واقع نورشاہ نے اس افسانے میں بیان کیا ہے کہ انتہا نام کی ایک لڑکی جو کشمیر کی سیر کرنے کے لیے آئی اور رات کو ایک ہاوس بوٹ میں رہتی ہے۔ اس کردار کو نورشاہ نے کافی سراہا ہے کہ کس طرح سے وہ کشمیر کے ایک سیدھے سادھے کشمیری نوجوان کو پیار کے جال میں پھنسا لیتی ہے۔ افسانہ بے موسم بادل سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''تم اکیلے نہیں ہو سلطان''
''اور کون ہے میرا''
''میں جو ہوں''
''میم صاحب آپ''
ہاں میری طرف دیکھو تمہاری زونی کا نیا روپ ہوں میں''
انتہا کا یہ روپ میرے لیے نیا تھا اور عجب بھی۔ میں نے کچھ کہنا
چاہا لیکن انہوں نے آنکھوں کی جنبش سے خاموش رہنے کا اشارہ
کیا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ اُبھری......

’’میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گی‘‘

’’کہاں‘‘......بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

’’اپنی دنیا میں‘‘

’’لیکن میری زونی، میرا گھر میری جھیل‘‘ ۲۰؎

نورشاہ یہاں کی تہذیب کو اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتنا مشکل ہوجاتا ہے ایک کشمیری کے لیے وہ اپنا سب کچھ یہاں سے چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جائے اور ہمیشہ وہاں کا ہو کر رہ جائے اُسے کشمیر کی یہ خوبصورتی یہ جھیل اور وادیاں رہ رہ کر ستاتی ہیں۔

نورشاہ نے اس افسانے میں ایک دل سوز عاشق کی داستان بیان کی ہے کہ کس طرح وہ اپنی معشوقہ سے سچا پیار کرتا ہے اور اُسی کی یادوں میں اپنی تمام زندگی گزارنا چاہتا ہے مگر اسی دوران اُس جھیل میں ایک سیاح لڑکی سیر کرنے کے لیے آتی ہے اور اُس دل سوز عاشق کو اپنے پیار کی جال میں قید کر لیتی ہے اور آہستہ آہستہ اُس کو اپنے ہمراہ اپنے شہر میں لے جانے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

آخر کار وہ دل سوز عاشق اُس کی ضد کے سامنے اپنا دل ہار جاتا ہے اور اُس کے ہمراہ اُس کے شہر چلا جاتا ہے مگر وہاں جا کر بھی وہ وہاں کا نہیں ہو پاتا سوائے اتنا کہ وہاں اُس کا کوئی دوست نہیں ہوتا اور اکثر وہ بھی گھر سے باہر رہتی ہے۔آخر کار وہ عاشق مجبور ہوجاتا ہے اور اُسے رہ رہ کر اپنی وادی کے یاد ستانے لگتی ہے۔اور اسی بات کو نورشاہ نے بھی اس افسانے میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح کشمیر کے باشندے کو یہاں کی وادیاں اور خوبصورت مناظر بھولائے نہیں بھولتے اور وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر اپنی محبوب وادی میں آجاتا ہے۔نورشاہ کے افسانے بے موسم بادل سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’اُس رات میں نے ایک خواب دیکھا جیسے ڈل میں ایک بار اور
سیلاب آیا ہو اور میرے سارے پہاڑی پھول، پہاڑی گیت

جھیل ڈل کی گہرائیوں میں کھو چکے ہوں۔ پری محل کی پُرسوز اور
پُردرد آوازیں خاموش ہوگئیں ہوں......میں نے سوچا انتہا نہیں
بلہ بے موسم کا بادل ہے اور میں اس کی دنیا سے پھر اپنی دنیا میں
لوٹ آیا۔اوراب مجھے کچّے موتیوں کے پکنے کا انتظار ہے۔''۲۱

نورشاہ نے جہاں ایک طرف کشمیر کی خوبصورتی اور دلکشی کا ذکر کیا ہے وہیں اُنہوں نے دوسری طرف اُس وادی کا ذکر بھی کیا ہے جہاں صرف پھول نہیں کھلتے بلکہ ننھے منھے بچوں کی لاشوں سے بھی کھیلا جاتا ہے اور تو اور کتنی عورتوں کا سہاگ اُجاڑ دیا جاتا ہے اور کتنے بچوں کو یتیم اور بے سہارا بنادیا جاتا ہے۔نورشاہ کا ایک افسانہ ہے''اللہ خیر کرے''اُس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں آج کی نہیں بلکہ اُس دور،اُس زمانے کی بات کررہا ہوں
،جب حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا تھا کہ ہامری پھولوں کی
وادی ایک جلتے ہوئے گھر کی مانند نظر آنے لگی تھی اور اس جلتے
ہوئے گھر میں پھولوں سے محبت کرنے والوں کی تمنائیں جل
جل کر سلگ سلگ کر راکھ بن رہی تھیں۔ صبح کا سورج خون
میں نہلایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وقت کس قدر بے رحم اور سنگ دل
ہو چلا تھا کہ آپسی رشتے بیمار سے دکھائی دینے لگے تھے۔''۲۲

نورشاہ نے اپنے تمام افسانوں میں باریک بینی سے کام لیا ہے اور ہر ایک افسانے میں وحدت تاثر کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جہاں اُنہوں نے کشمیر کی تہذیب کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے تو اُس میں دونوں پہیوں کو برابر دکھانے کی کوشش کی ہے یعنی کہ اُنہوں نے اعتدال سے کام لیا ہے اور اگر انہوں نے سکے کا ایک رُخ دکھانے کی کوشش کی ہے تو دوسرے رُخ کو چھپایا نہیں بلکہ اُس کو بھی واضح کیا ہے اور یہی ایک اچھے افسانہ نگار کی پہچان بھی ہے۔اگر چہ نورشاہ نے کشمیر کی

خوبصورتی کا ذکر کیا ہے یہاں خوبصورت پہاڑوں، آبشاروں کا ذکر کیا ہے تو وہاں ہی دوسری طرف کشمیر پر ہو رہے ظلم وستم کو بھی کھلے طور پر عیاں کیا ہے۔

جہاں ایک طرف اُنہوں نے گلمرگ، یوس مرگ، سونامرگ کا ذکر کیا ہے۔ تو وہیں دوسری طرف بے سہارا ماؤں، یتیم بچوں، اور بیوہ عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے سر سے اُن کے خاوند کا سایہ چھین لیا گیا۔

نورشاہ نے اپنے ایک افسانے ''درد آتا ہے دبے پاؤں'' میں کشمیر کی خوبصورتی اور یہاں کے تمدن کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہاں میں جو کہہ رہا ہوں وہ ایک حقیقت ہے ایک سچائی ہے۔ تپتی دھوپ میں جب انہیں اپنے چناروں کی ٹھنڈی آغوش یاد آتی ہے تو ان کی آنکھوں سے کود بخود آنسو امڈ آتے ہیں۔ جب پانی حاصل کرنے کے لیے انہیں نل کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔تو یہاں کی جھیلیں ان کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہیں۔ یہ برف پوش پہاڑ، یہ ندی نالے یہ پودوں سے بھرپور باغات اب شاہد ان کی تقدیر میں نہیں، ہاؤس بوٹ، ڈونگے شکارے ان کی ساخت اور بناوٹ ان کے آنے والی نسلیں صرف کتابوں سے جان سکیں گئے۔'' ۲۳

نورشاہ نے اپنے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر کے وہ لوگ جو کشمیر سے باہر جا کر رہے ہیں اور اپنے بچوں کی پرورش باہر کے ملکوں یا پھر باہر کی ریاستوں میں کرتے ہیں۔یعنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر گئے ہیں، کو اُنھیں جب کشمیر کے ٹھنڈے چناروں کی چھاوں یاد آتی ہے تو وہ خون کے آنسو روتے ہیں یہاں کی آبشاروں اور یہاں کے باغات وغیرہ تمام چیزوں کا اُن کو شدت سے

احساس ہوتا ہے۔

نورشاہ نے اپنے تمام تر افسانوں میں کشمیر کے خوبصورت حُسن و جمال کو جگہ جگہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہاں کی خوبصورتی کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ اپنے افسانے ''خوشبو کا سفر'' میں بھی اُنہوں نے گلمرگ کی خوبصورتی کو بیان کیا ہے اس افسانے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''جیسے گلمرگ کی پر چھائی چھوکر کسی نوخیز اور نوعمر دوشیزہ کے مرمریں جسم کا لمس کا احساس ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح بُلبل کی ریاں جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک عجیب سی ان دیکھی لذت حاصل ہوتی ہے۔ بلبل بے حد سندر ہے۔ سفید بے داغ جنگلی گلاب کا سا رنگ، خوابوں سے بھر پور موٹی موٹی آنکھیں اور گردن پر لمبے لمبے بال۔ بلبل میرے گھوڑی کا نام ہے اور گلمرگ میں کافی مشہور ہے۔'' ۲۴

جہاں ایک طرف اُنہوں نے یہ اقتباس لکھ کر گلمرگ کی خوبصورتی کے بارے میں ذکر بھی کیا ہے جو گلمرگ میں سیاح حضرات کو اپنے گھوڑوں سے اُس وادی کا سیر کراتے ہیں اور اُنہوں نے پیار کے لیے اپنے گھوڑوں کے نام بھی منسوب کیے ہیں بلبل کے نام سے۔

> ''ہاں ایک اور بات مسز شکب اور شیلا بہترین دوست ہیں۔ ان کا اکثر وقت ایک ساتھ گزرتا ہے۔ یوں تو صورت کے لحاظ سے منر شکب، شیلا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اور پھر اس کا رنگ بھی بے حد کالا ہے۔ لیکن اس کے خدوخال دلکش ہیں اس کی آنکھوں میں کنول کے پھولوں جیسی شادابی ہے۔ اس کے گھنگریالے بال۔ رات جیسے تہہ بہ تہہ اتر رہی ہو۔ اس کے

ہونٹوں کا رنگ جیسے کشمیر کی نمکین چائے کا رنگ ان میں سمٹ کر
آ گیا ہو۔ اور شیلا وہ تو بس سپید سپید سی چاندنی میں نہلائی ہوئی
ایک پری لگتی ہے۔'' ۲۵

اس افسانے کے اس اقتباس میں نور شاہ نے دو عورتوں کی دوستی کی کہانی بیان کی ہے۔ شیلا جو کہ کشمیر کی ہوتی ہے اور منر شکب جو کہ افریقہ کی ہوتی ہیں۔ مصنف نے ان دونوں کے حُسن کو کشمیر کے مختلف رنگ برنگے پھولوں اور کشمیر کی خوبصورت نمکین چائے کے رنگ سے تشبیہہ دے کر کشمیر کے حسن اور یہاں کی خوبصورتی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر کی تہذیب کا اور یہاں کے تمدن کا اثر ایسا ہے کہ وہ جس سے بھی ملتے ہیں اُس میں اپنا اثر باقی چھوڑ دیتے ہیں۔

نور شاہ اپنے ایک افسانے ''میری کہانی کا سچ'' میں کشمیر کی تہذیب اور یہاں کے خوبصورت باغات اور پارکوں کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''ایک بار صرف آپ کی آواز کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں،
کہوں کہ اس میں میرا ماضی ہے۔ میرے ماضی کی یادیں ہیں
۔کبھی شام کے بلواڑ روڑ کے سامنے والے پارک میں آیئے۔
میری اداسن اداس ور دھندلی دھندلی سی شاموں کا یہی ٹھکانہ
ہے۔'' ۲۶

نور شاہ نے اپنے اس افسانے میں کشمیر کی تہذیب کا کافی بڑھ چڑھ کا ذکر کیا ہے اور گُلمرگ کے آس پاس مقیم لوگوں کی مفلسی، مجبوری، ناداری اور غریبی کو اپنے افسانے ''علیا اور بلبل'' میں دکھانے کی ایک خوبصورت کوشش کی ہے۔

یہ اقتباس افسانہ علیا اور بُلبل سے ملاحظہ فرمائیں:

''بھائی گھوڑے والے تمہاری یہ تیز رفتار گھوڑی تم ہی کو مبارک

ہو۔ میں پہلی بار گھوڑی سواری کر رہا ہوں، کہیں دور نیچے گرا دیا
تو......؟ نابھی نا اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ مگر تیزی سے
بولا بابو جی برا نہ مانئے گا۔
ایک بات بتاؤں؟
کیا؟ میں نے چونک کر پوچھا۔
سچ پوچھے تو یہ گھوڑی بڑی سست رفتار ہے۔
پھر ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟
بابو جی کیا کریں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔'' ۲۷

نورشاہ نے اس افسانے میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ گلمرگ کے لوگ جو گھوڑے رکھتے ہیں وہ کافی غریب ہیں اور جب کوئی سیاح اُن کے گھوڑوں کی سواری نہ کرنا چاہتا ہو تو اُس کو گھوڑوں کی تیز رفتاری سے مائل کیا جاتا ہے مگر جب اُن کے جھوٹ سے پردہ فاش ہو جاتا ہے تو پھر وہ سچ بتا دیتے ہیں کہ ہم بے بس ہیں کیونکہ ہماری آمدنی کا واحد راستہ یہی ہے اور یہاں سے ہی چار پیسے آتے ہیں تو اُن سے ہم اپنے گھر والوں اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

نورشاہ نے اسی افسانے علیا اور بُلبل میں ایک جگہ پھر سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ گلمرگ میں موسم کیسے کروٹ بدلتا رہتا ہے کبھی دھوپ اور کبھی بارش کا سماں رہتا ہے۔

''گلمرگ کا موسم کا کبھی بھروسہ نہیں، ابھی تپتی ہوئی دھوپ ہے
اور ابھی موسلا دھار بارش۔ اس لیے جب گلمرگ میں ہمارے
پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہوگئی...... میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھ
گیا، اور دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ گلمرگ کی خوبصورتی میں
کھو گیا...... گلمرگ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔'' ۲۸

نورشاہ نے کشمیر کی تہذیب وتمدن اور یہاں کی خوبصورتی کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان میں پہلا نام جو ذہن وزبان پر آتا ہے وہ نورشاہ کا ہے۔ اُنہوں نے ڈلِ جھیل اور تمام تر خوبصورت مقامات کا ذکر اپنے افسانوں میں بڑھ چڑھ کر کیا ہے اور اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کا بچپن ڈل جھیل کے پاس گزرا ہے۔ مصنف نے جگہ جگہ اپنے افسانوں میں کشمیر کی تہذیب اور خوبصورتی کا ذکر کیا ہے ''افسانہ بٹوٹ کی آخری رات'' میں بھی کشمیر کے حسن و جمال کو اپنے لفظوں میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ وہ بٹوت کی آخری رات میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے، کشمیر کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی حسن کی باتیں، حسین مرغزاروں کی باتیں، کشمیر کے ملکوتی پہاڑوں کی باتیں، زعفران زاروں کی باتیں، ہم نے باتیں ان لوگوں کی کی، جو کشمیر کے کھیتوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ ڈھلانوں پر سیاح لوگوں کو گھوڑوں کے آگے پیچھے ننگے پاؤں دوڑتے ہیں۔ اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ یا ہنستے اور کانپتے ہوئے پہلگام کے حسین مرغزاروں میں گورے اور کالے لوگوں کے درمایں گھرے ہوئے۔ اپنے چاک پیرہن رفو کرنے والوں کی۔ ان لوگوں کی جو دوسروں کے لیے پھول چنتے ہیں اور اپنے لیے دلوں کے مرجھائے اور پژمردہ گلوں کا ہار پروتے ہیں۔ کشمیر کے ان لوگوں کی باتیں جو جھیل ولر کی وسیع گہرائیوں میں خاردار سنگھاروں کے لیے غوطے لگاتے ہیں۔'' ۲۹

نورشاہ نے اس افسانے میں کشمیر کی ہر اُس چیز کی تعریف کی ہے جس کی وجہ سے کشمیر کی

خوبصورتی اور یہاں کی تہذیب کو چار چاند لگائے ہیں۔ان ہی لوگوں کی محنت اور کاوش کی وجہ سے کشمیر آج جنت بے نظیر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔اور یہی وہ کلچر ہے جس کی وجہ سے یہاں کی مخلوط تہذیب اپنے آپ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

نورشاہ نے کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے افسانہ ''میرے حصّے کا خواب'' میں کشمیر کے دو مشہور مقامات کا ذکر کیا ہے وہ دو خوبصورت مقامات ٹنگمرگ اور گلمرگ ہیں۔مصنف یوں رقمطراز ہیں:

''ٹنگمرگ اور گلمرگ کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا۔آپ شاید وہاں گئے بھی ہوں گئے۔ جسے سمے اور جل نے مل کر تراشا ہے......چاروں سمت برف ہی برف،سفید سفید سی بے داغ برف رنگوں کے لئے روپ اور یہاں پھول کھلتے ہیں۔'' ۳۰

نورشاہ نے یہاں کی تہذیب کو کشمیر کے خوبصورت برفیلے پہاڑوں سے تشبیہ دی ہے اور کشمیر کے سفید پھولوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح سے یہان سفید پھول کھلتے ہیں یہاں کی تہذیب وتمدن میں بھی ان پھولوں کی طرح چمک و دمک ہے اور یہاں کا تمدن بالکل بے داغ ہے کسی بھی انسان کے دل کے اندر کسی دوسرے آنے والے انسان کے لیے کوئی بغض وعناد نہیں۔ اور یہی تہذیب ہمارے کشمیر کی ہے صرف اور صرف اخوت ومحبت پر مبنی ہے۔

نورشاہ کا ایک افسانہ مرغابی ہے اُس میں بھی اُنہوں نے تہذیبی نکتے کو ابھارا ہے اور خاص کر کشمیر کی عورتوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کس طرح کشمیر کی تہذیب کو سنوارنے میں ہر جگہ پیش پیش نظر آتی ہیں اور کشمیر کی عورتوں کے شرم وحیا کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ باپردہ اور بالباس اور شوہر کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔

''یہ تو اپنی تہذیب ہے مرد کماتے ہیں،محنت کرتے ہیں،عورتوں کی اپنی دنیا ہے،اپنی تہذیب ہے۔یہاں کی عورتیں اپنے خاوند

کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ غیروں کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتی
ہیں۔آپ کے یہاں عورتیں حسن کی نمائش کرتی ہیں، دوست
بناتی ہیں۔'' ۳۱

نورشاہ نے اپنے اس افسانے میں کشمیری عورتوں کی وہ تمام تر خوبیاں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جن کا خاص کر یہاں کی تہذیب سے براہ راست تعلق ہےاور یہ بات بھی اُجاگر کی ہے کہ عورتیں کسی ڈر کی وجہ سے پردہ نہیں کرتی اور نہ ہی کسی ڈر کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتی ہیں بلکہ اُن کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی انسان کی محبت ہوتی ہےاور وہ انسان ہوتا ہے اُن کا خاوند اُن کا سرتاج اور یہی کشمیری تہذیب کی خوبصورتی بھی ہے جو دوسری ریاستوں سے منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

نورشاہ کے افسانے ''جھیل اور سائے'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کشمیر تو دل سے دیکھنے کی چیز ہے اور میرا دل بجھا ہوا ہے۔
کہاں سے لاؤں وہ دل، کہاں سے لاؤ وہ جذبہ......اور کشمیر
آتے ہی انسان اپنی رگوں میں تازہ خون دوڑتے ہوئے محسوس
کرتا ہے۔کشمیر کی مٹی میں کچھ ایسا ہی اثر ہے۔اپنی پرانی زندگی
اور ماضی کو بھول جاتا ہے، پرانے زخم پرائے ہوجاتے ہیں،
کونپلیں پھوٹ جاتی ہیں اور ارمانوں کی گنگا بہنے لگتی ہے۔'' ۳۲

الغرض یہ کہ نورشاہ کے جتنے بھی افسانے کشمیر کے بارے میں لکھے گئے ہیں یا پھر کشمیری تہذیب پر لکھے ہیں اُن سب افسانوں میں جگہ جگہ کشمیری تہذیب کی ہو بہو عکاسی دیکھنے کوملتی ہے چاہیے وہ افسانہ ''بے موسم بادل ہو'' کیسا ہے یہ جنون ہو، ''درد آتا ہے دبے پاؤں'' ہوافسانہ خوشبو کا سفر ہو، منر شکیب اور شیلا ہو، میری کہانی کا سچ ہو، علیا اور بُلبل ہو، بٹوٹ کی آخری رات ہو میرے حصے کا خواب ہو، مرغابی ہو

اور چاہے جھیل اور سائے ہو ان تمام تر افسانوں میں نور شاہ نے کشمیر کی تہذیب کے بارے میں یہاں کے تمدن کے بارے میں اور یہاں کے حالات و واقعات کے بارے میں بڑھ چڑھ کر لکھا ہے اور کشمیر کی خوبصورتی اور یہاں کی تہذیب کے بارے میں بہت سراہانا کی ہے۔

نور شاہ نے کشمیر کی مخلوط یعنی ملی جُلی تہذیب کا ذکر اپنے افسانوں میں جا بجا گیا ہے اُنہوں نے ایک افسانے ''پہچان'' میں کشمیر کے گُجر طبقے کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ خانہ بدوش طبقہ کہلاتا ہے اور عموماً زیادہ تر یہ طبقہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مال مویشوں کے ساتھ ،ہجرت کرتا رہتا ہے۔ زیادہ تر ان کا بسیرا پہاڑوں میں ہوتا ہے۔

نور شاہ نے اپنے افسانوی مجموعے ''لفظ لفظ داستان'' کے ایک افسانے پہچان میں اس طبقے کا ذکر کیا ہے۔نور شاہ یوں رقمطراز ہیں۔

> ''اُجلے اُجلے پہاڑوں کے دامن میں آباد گوجر بستی یوں تو سبزہ زاروں میں ہستی مسکراتی نظر آتی تھی لیکن چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں کے درمیان چودھری منور علی کا حویلی نما مکان ایک قلعہ کی مانند نظر آتا تھا۔ چودھری صاحب کو انتقال کئے اب کافی عرصہ گزر چکا تھا۔لیکن نہ صرف حویلی بلکہ پوری گوجر بستی اُن کے نام اور کام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ بہت بڑا گھر نہ اس حویلی نما مکان نہیں آباد تھا اَن گنت افراد خانہ اس کی زیبائش بڑھاتے تھے۔'' ۳۳

نور شاہ نے اس افسانے میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ پہلے زمانے میں لوگ کس طرح محبت واخوت اور بھائی چارہ سے زندگی بسر کرتے تھے اور ایک ہی گھر میں بہت سارے کنبے اور خاندان مل جُل کر رہتے تھے۔اور اپنی کشمیری تہذیب کا خیال رکھتے تھے۔اور گھر کے بڑے بزرگوں کا

سایہ اپنے لیے غنیمت سمجھتے تھے۔

نور شاہ نے کشمیری تہذیب اور یہاں کی خوبصورتی کا ذکر اپنے ایک افسانے ''انجانے اتھاس کی کڑیاں'' میں بھی کیا ہے۔اس افسانے میں نور شاہ نے کنول کے پھول کی منظر کشی پیش کی ہے اور یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب جھیل ڈل میں کنول کے پھول کھلتے ہیں تو وہ کس طرح کا منظر پیش کرتے ہیں اور اُن پھولوں کی مہک سے پوری ڈل جھیل مہک جاتی ہے اور سیاح حضرات اور مقامی لوگ کنول کے پھولوں کے حُسن سے دوبالا ہوتے ہیں۔

> ''پانی آس پاس پھیل گیا اور پھیلتے پھیلتے پیڑوں کو چھونے لگا اور یہ جنگل ایک بڑی وسیع جھیل میں تبدیل ہوگئے اور پھر ایک سرفراز گھنی شاخوں والے دیودار کے پیڑ کے سائے میں کنول کا پھول کھلا اس دھرتی کا پہلا پھول میری بے خواب آنکھیں کھل گئیں۔'' ۳۴؎

کشمیری زبان میں کنول کے پھول کو پمپوش کہا جاتا ہے اور اس نام سے دیپک کنول نے اپنا ایک افسانہ بھی تحریر کیا ہے! کیونکہ کنول کے پھول کو ہندو مذہب کے لوگ بہت ہی معتبرک مانتے ہیں اور دیوی دیوتاؤں کے آستانوں پر اس پھول کو چڑھاوے کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔

نور شاہ کا ہر ایک افسانہ ایسا ہے جس میں کہیں نہ کہیں کشمیر کی تہذیب اُبھر کر سامنے آتی ہے مگر انداز الگ ہے اور پیش کرنے کا طریقہ جُدا ہے۔اُن کی ہر ایک تحریر ایسی ہے جس سے کہیں نہ کہیں خوبصورتی، دُکھ، درد، خوشی سب چیزیں نمایاں طور پر جھلکتی ہیں ایسے ہی نور شاہ کا ایک افسانہ ''صلیب'' ہے جس میں اُنہوں نے چنار کے درخت کا ذکر کیا ہے اور جہاں کہیں بھی چنار کے درخت یا چنار کے پتوں کا ذکر آتا ہے تو وہ مایوسی اور خون کی علامت میں ہی پیش کیا جاتا ہے نور شاہ کے افسانوں میں ''صلیب'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''میں تنہا ہوں! میرے آنگن میں چنار کا درخت سپیدی برف
میں دبا ہوا بے حد اداس کھڑا ہے۔ آکاش کی جانب اپنی ننگی
باہیں پھیلائے دیکھ رہا ہے۔ ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر
صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے۔'' ۳۵

نورشاہ نے جن حالات کو مدنظر رکھ کر یہ افسانہ لکھا ہے اُس سے یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ کشمیر کی تہذیب وتمدن پر کن کن چیزوں کا براہ راست اثر پڑا ہے اوران حالات سے کشمیری تہذیب کس حد تک متاثر ہوئی ہے۔

نورشاہ نے اپنے افسانوں میں کشمیری تہذیب کو اُجاگر کرنے کے لیے کشمیر کے خوبصورت پیڑوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے کشمیر کی خوبصورتی کو چار چاند لگتے ہیں۔ اپنے ایک افسانہ''اندھیرے اُجالے''میں یوں رقمطراز ہیں:

''میرا سینی ٹوریم چیڑ اور دیودار کے درختوں میں گھری سپید
عمارت بڑے بڑے ہوادار روشن کمرے۔ خاموش پُر اسرار
برآمدے دیواروں پر عشق و ہیجان کی سجی سنوری بیلیں، دودھ
جیسی نرمل چاندنی کی شیتل شیتل کرنیں جب درختوں کی شاخوں
چھن چھن کر سینی ٹوریم کی سفید عمارت پر بکھر جاتی ہیں تو ایسا
معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں ہلکی ہلکی موسیقی پھیل رہی ہو۔'' ۳۶

نورشاہ نے اس افسانے میں چیڑھ اور دیودار کے درختوں کی خوبصورتی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جیسے کسی خوبصورت اور بلند و بالا عمارت پر رات کے وقت چاند کی چاندنی گرنے سے وہ خوبصورت عمارت جگمگا اُٹھتی ہے۔ بالکل ہو بہو یہی منظر تب دیکھنے کو ملتا ہے جب چیڑ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں پر برف پڑتی ہے اور وہ برف اُن پیڑوں کے ساتھ چپک جاتی ہے تو رات کے وقت جب چاندنی

بکھرتی ہے تو اُن برف نما پیڑوں پر ہو بہو وہی نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے جو کہ ایک بلند و بالا سینی ٹوریم کو دیکھتے وقت ملتا ہے۔

نور شاہ نے کشمیر کی خوبصورتی اور وہاں کی تہذیب کو اُجاگر کرنے کے لیے اپنے افسانوں میں جا بجا سفیدے کے پیڑ کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیونکہ سفیدے کا پیڑ کشمیر میں کثرت سے پایا جاتا ہے اور یہ بہت ہی کار آمد درخت ہوتا ہے ایک تو یہ بہت لمبا ہوتا ہے اور دوسرا اس میں کوئی گھانٹ نہیں ہوتی اور بہت سی چیزیں بنانے کے کام بھی آتا ہے۔ فرنیچر وغیرہ کا بھی بہت سامان اسی لکڑی سے تیار ہوتا ہے۔

نور شاہ نے اپنے افسانے 'اندھیرے اُجالے' میں اس درخت کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس درخت کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''کشمیر میں کہاں رہتے ہو؟
''سرینگر......؟ اس کے لہجے میں ایک آرزو تھی ایک تمنا تھی۔ تم گئی ہو کبھی سرینگر؟'' میں نے پوچھا
''ہاں ایک بار جب میں ٹرینگ کر رہی تھی وہاں ہم ٹور پر گئے تھے۔''
''تمھیں کیا پسند آیا؟''
اس نے ایک آہ بھر کر کہا ''سفیدے کے لمبے لمبے پیڑ'' سفیدے کے پیڑوں سے میرے بچپن کا تعلق ہے۔'' ۳۷

نور شاہ نے جہاں ایک طرف کشمیر کی تہذیب کو اُجاگر کرنے کے لیے خوبصورت پیڑوں اور جھیلوں کا ذکر کیا ہے تو وہیں دوسری طرف انہوں نے اپنے افسانوں میں مرگوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

نور شاہ اپنے افسانے ''بے معنی سفر'' میں یوس مرگ کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''اس لمحے کی تلاش میں جب میں نے ترانہ کو یوس مرگ کے

سرخ چھت والے ریسٹ ہاؤس میں دیکھا تھا۔ سپید سپید بادل
چڑھ کے درختوں پر کافی چمک آئی تھی اور بارش کی ایک نمی سی بوند
اس کی قفقازی ناک پر جھلملا رہی تھی۔'' ۳۸

نورشاہ نے یوس مرگ کی خوبصورتی کو اس افسانے میں کرداروں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح یوس مرگ کا جو سُرخ گھاس ہے اور وہاں کا سبزہ جو اپنی خوبصورتی کی ایک منفرد پہچان ہے۔ جب کوئی سیاح وہاں سیر کرنے جاتا ہے تو اپنے قدم جب اُس گھاس پر رکھتا ہے تو وہ گھاس نیچے کی طرف دب جاتی ہے اور جب اپنا قدم اُٹھاتا ہے تو دوبارہ سے وہ اوپر آجاتی ہے۔ یہی خوبصورتی یوس مرگ کو ممتاز بناتی ہے۔

نورشاہ نے کشمیر کی تہذیب اور خوبصورتی کی عکاسی اپنے افسانے ''بے جڑ پودے'' میں ڈل جھیل کے پانی او اُس میں کھلے کنول کے پھولوں اور ہاؤس بوٹ کی لمبی قطاروں کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے:

''سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھلتے
کنول کے پھول نظروں کے سامنے بکھر جاتے ہیں۔ ہاؤس
بوٹوں کی لمبی قطاریں گھوم پھر جاتی ہیں۔ ڈوبنے اُگتے سورج کا
منظر نگاہوں میں اتھل پتھل مچا دیتا ہے۔ خاموش راتوں کی
چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے اَن دیکھی پریوں کے
گیت سنائی دیتے ہیں!'' ۳۹

نورشاہ نے اس افسانے میں ڈل میں بکھرے کنول کے پھولوں کی خوبصورتی کا بھرپور انداز میں ذکر کیا ہے کہ جب ڈل جھیل میں سورج کی روشنی اُن پھولوں پر پڑتی ہے تو اُن کا حُسن اور بھی دوبالا ہوجاتا ہے اور پانی پر بنے ہاؤس بوٹ جو ہیں یعنی جو ڈل میں پانی پر بنے گھر ہیں وہ بھی وہاں کی خوبصورتی

میں چار چاند لگاتے ہیں اور ڈل کے سامنے جب پری محل کے کھنڈروں پر سورج کی روشنی پڑتی ہے تو وہ الگ ہی قسم کا منظر پیش کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان دُنیا سے دور نہیں بلکہ کسی طلسماتی مقام پر چلا آیا ہے اور جہاں صرف اور صرف چاروں طرف خوبصورتی ہی خوبصورتی نظر آتی ہے۔ اور یہی کمال ہے نورشاہ کے افسانوں کا کہ قاری جب اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو خود اُس جگہ پر پاتا ہے۔

نورشاہ نے جہاں ایک طرف کشمیر کی تہذیب کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے وہاں کے پیڑوں، وہاں کی جھیلوں اور وہاں کی قبروں کا ذکر کیا ہے ایسے ہی اُنہوں نے اپنے ایک افسانے میں کشمیر کے سرد موسم کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب کشمیر میں شدت کی سردی ہوتی ہے موسم سرما میں اور برف کافی مقدار میں ہو جاتی ہے تو اُس وقت وہاں کے لوگوں کا گزر بسر کیسے ہوتا ہے۔ نورشاہ اپنے ایک افسانے ''رات کا سورج'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''یوں تو میں یہاں کے گرلز کالج میں لیکچرار ہوں لیکن کہانیوں کی تلاش میں اکثر گھومتی پھرتی ہوں، اس پہاڑی علاقے میں اس وجہ سے آئی تھی سوچا تھا کہ موسم مہربان ہوگا۔ دھوپ کا آنچل ہوگا۔ نئے کردار نیا ماحول اور نئی پرانی کہانیاں ہوں گی۔ کہانیوں کے دھندلے دھندلے سے مٹے مٹے سے نقوش پھر جاگیں گے۔ مگر یہاں کے موسم کا کیا بھروسہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی اور ٹھنڈ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ برآمدے تک آنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سارا سارا دن آتش دان کو جلائے رکھنا پڑتا۔ ریسٹ ہاؤس کے آنگن میں لکڑیوں کا انبار پہلے ہی سے پڑا تھا۔'' [۴۰]

نورشاہ نے اس افسانے میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سردیوں کے موسم میں کشمیر میں لوگوں کو پہلے سے ہی موسم سرما کے لیے سامان مہیا کرنا پڑتا ہے اور سخت سردیوں میں گھر سے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور دن بھر صرف آتش دان کے سامنے بیٹھا جاتا ہے اور یہ دن جو ہوتے ہیں سخت سردی کے کشمیری زبان میں اس کو ''چلہ کلاں'' کہا جاتا ہے۔ دن میں اتنی سخت قسم اور کڑاکے کی سردی ہوتی ہے کہ ہر چیز کہرا بن جاتی ہے۔ برف کو پگلا کر پانی بنایا جاتا ہے اور پھر اُس کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔

کشمیری قوم مہمان نوازی میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے اور یہ کشمیریوں کی ایک خاص قسم کی تہذیب ہے کہ وہ گھر آئے مہمان کو کبھی بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ ہمیشہ اُس کی اچھے طریقے سے خاطر تواضع کرتے ہیں اور جاتے وقت کوئی نہ کوئی تحفہ بھی ساتھ میں ضرور پیش کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقع نورشاہ اپنے افسانے ''گھر بے گھر'' میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں نورشاہ اسطرح رقمطراز ہیں:

> ''وکٹر ہمیں کچھ کرنا چاہیے اس عورت کو سڑک پر نہیں دیکھ سکتے ، وہ ماں بننے والی ہے'' دیکھو روزی کا کمرہ خالی ہے اس عورت کو اس کے کمرے میں شفٹ کر لیتے ہیں'' ڈاکٹر چونک پڑا لیکن خاموش رہا۔
>
> روزی کا کمرہ کھول دیا گیا۔ بستر بچھا دیا گیا۔ کمرے کو روشن کیا گیا اور وہ عورت جو ہم سب کے لیے غیر تھی۔ اجنبی تھی سڑک سے روزی کے بستر پر آ گئی۔'' [۱۴]

نورشاہ نے اس افسانے میں یہ بات اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کشمیری لوگ کس قدر بڑے دل والے سخی اور مہمان نواز ہیں اُنہیں باہر سے آئی ہوئی ایک فیملی کا دُکھ برداشت نہ ہوسکا اور اُنہوں نے اُن کو اپنے گھر میں جگہ دیا ور اپنی بیٹی روزی کا کمرہ جو خالی تھا اُس میں اُن کو منتقل کر دیا۔

سب سے بڑی تہذیب جو کشمیر کی ہے وہ یہی ہے کہ اُن سے کسی کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا اور اگر کوئی انسان دُکھی ہوتا ہے تو اُس کے دُکھ میں خود شریک ہوجاتے ہیں اور اُس کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کشمیری تہذیب میں برف بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ موسم سرما میں جب برف کافی مقدار میں گرتی ہے تو راستے بند ہوجاتے ہیں اور کام کاج ٹھپ ہوکر رہ جاتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بھی بہت ساری پریشانیوں اور دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔نورشاہ اپنے ایک افسانے''اُس کی گلی کا پاپ''میں برف سے متعلق ذکر کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''میرے کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ کُھلا ہوا ہے! لمحے پگھل رہے ہیں!! برف گر رہی ہے میرے من میں ایک دبی دبی سی تپش پھر سے اُبھر رہی ہے. جی چاہتا ہے کہ اپنا گریبان چاک کردوں اور اسی کھڑکی سے دبے پاؤں کو باہر کھلی فضاؤں میں گھومتا رہوں تاکہ جو تپش میرے من میں ہے پُرسکون ہوجائے۔ یہ آگ جو میرے سارے جسم میں ہے بجھ کر راکھ ہوجائے لیکن یہ بھی کیا زندگی ہے جو اس قدر بے بس ہے، بس دو قدموں کی تو بات ہے صرف دو قدموں کے فاصلے پر زیب رہتی ہے اور یہ فاصلہ طے کر کے اُسے مل نہیں سکتا۔مل کر ڈھارس نہیں دے سکتا،اس کے جلتے ہوئے سینے کو اپنی مجبوری کے آنسوں سے ٹھنڈا نہیں کرسکتا، یہ سب کچھ کرنے کے لیے گھر کی گلی سے گزرنا ہوگا۔'' ۴۲؎

نورشاہ اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ جب موسمِ سرما میں شدت کی برف باری ہوجاتی ہے تو عاشق کو اپنے معشوق سے ملنے کے لیے ایک گلی بھی پار کرنا پل صراط کی مانند ہوجاتا

ہے۔نور شاہ نے کشمیر کی خوبصورت جھیلوں اور وہاں کے شگوفوں اور ناشپاتیوں کا ذکر اپنے ایک افسانے 'مرے خوف کی کہانی' میں اسطرح پیش کیا ہے:

''میرے اللہ میں یہ سب کیا سوچ رہی ہوں ،میں جاگتے میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں ،کسی آن دیکھنے سپنے میں رنگ تو نہیں بھر رہی ہوں۔ ویسے رنگ میری زندگی کا ایک حصہ ہیں اور میں ان رنگوں کی تلاش میں ممبئی سے کشمیر آئی ہوں۔ کشمیر جہاں کینوا س پر رنگ بکھرتے سمے دھند میں لپٹی ہوئی صبح جاگنے کا احساس ہوتا ہے، جہاں تارے لرزتے ہیں اور ڈل اور نگیین جھیلوں کی دھڑکنیں جاگتی ہیں اور سورج کی سرخ روشنی میں ناشپاتی کے سپید شگوفوں کا رنگ ملگجی ہوجاتا ہے۔'' ۴۳؎

نور شاہ نے کشمیر کی ڈل جھیل اور وہاں کے شگوفوں کا ذکر سیاح حضرات کے زبانی کیا ہے کہ جب بھی لوگ باہر کی ریاستوں اور ملکوں سے لوگ کشمیر آتے ہیں اور یہاں کی تہذیب اور یہاں کی خوبصورتی سے کس درجہ لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ایسا پاتے ہیں کہ وہ کسی جنت کی سیر کر رہے ہیں یا پھر کوئی ایسا خواب دیکھ رہے ہیں جس پر اُن کو یقین نہیں ہو رہا ہے یہ نہ صرف کشمیر کے حسن اور حسین نظاروں سے متاثر ہوتے ہیں بلکہ یہاں کے لوگوں کے اپنے جینے کے خاص ڈھنگ،ان کی خاص زبان، ان کے لباس،ان کے آداب،ان کے خاص پکوان،ان کی مہمان نوازی اوران کی سلوک و برتاؤ کی غرض یہاں کی تہذیب سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔نور شاہ کے افسانوں میں ہمیں یہ تہذیب بخوبی نظر آتی ہے۔نور شاہ نے بحثیت ادیب اپنے ماخول اور تہذیب کو اپنے افسانوں میں بخوبی پیش کر کے ایک کشمیری ہونے کا حق بجا طور پر ادا کیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ فکر و فکشن، ڈاکٹر محمد اقبال لون، میزان پبلشر سرینگر، ص ۴۵

۲۔ افسانہ، اندھیرے اُجالے، افسانوی مجموعہ، لفظ لفظ داستان، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۴۱

۳۔ ایضاً، ص ۴۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۔ بے ثمر سچ، نور شاہ، ناشر امیکس بُکس این۔ آئے۔ ٹی روڈ حضرت بل سرینگر، ص ۳۵

۶۔ بے معنی سفر، افسانوی مجموعہ، ایک معمولی آدمی، نور شاہ، میزان پبلشر سرینگر، ص ۴۲

۷۔ فکر و فکشن، پروفیسر شکیل الرحمٰن، میزان پبلشر سرینگر، ص ۲۴۰

۸۔ افسانہ، بدن، افسانوی مجموعہ، لفظ لفظ داستان،، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۳۵

۹۔ افسانہ، رات ایک سمٹی ہوئی، افسانوی مجموعہ، من کا آنگن اداس اداس، نور شاہ، پبلک پبلکیشنز پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی، ص ۲۲

۱۰۔ افسانہ، کیسا ہے یہ جنون، افسانوی مجموعہ، کیسا یہ جنون، نور شاہ، الفجر پرنٹس سری نگر کشمیر، ص ۲۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۳۔ فکر و فکشن، ڈاکٹر محمد اقبال لون، میزان پبلشر سرینگر، ص ۲۰۷

۱۴۔ ماں نہیں روئی، افسانوی مجموعہ، ایک معمولی آدمی، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۲۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۸۔ بے موسم بادل، افسانوی مجموعہ، ایک معمولی آدمی، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۲۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۲۔ اللہ خیر کرے، افسانوی مجموعہ، ایک معمولی آدمی، نور شاہ، میزان پبلشرز سری نگر، ص ۵۷

۲۳۔ درد آتا ہے دبے پاؤں، افسانوی مجموعہ، کشمیر کہانی، نور شاہ، میزان پبلشرز سری نگر، ص ۴۰

۲۴۔ خوشبو کا سفر، افسانوی مجموعہ، بے ثمر سچ، ناشر امیکس بکس این۔ آئے۔ ٹی روڈ حضرت بل سرینگر، ص ۳۴

۲۵۔ مسز شکب وشیلا، افسانوی مجموعہ، ویرانے کے پھول، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر ص ۴۴

۲۶۔ میری کہانی کا سچ، افسانوی مجموعہ لفظ لفظ داستان، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۶۵

۲۷۔ علیا اور بلبل، افسانوی مجموعہ، کشمیر کہانی، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۳۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۵

۲۹۔ بٹوٹ کی آخری رات، افسانوی مجموعہ، من کا آنگن اداس اداس، نور شاہ، پبلک پبلکیشنز پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی، ص ۱۸

۳۰۔ میرے حصے کا خواب، افسانوی مجموعہ، من کا آنگن آنگن اداس اداس، پبلک پبلکیشنز پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی، ص ۶۶

۳۱۔ افسانہ، مرغابی، ایضاً، ص ۳۵

۳۲۔ جھیل اور سائے''، ایضاً، ص ۱۵

۳۳۔ پہچان، افسانوی مجموعہ، لفظ لفظ داستان، نور شاہ، میزان پبلشرز سرینگر، ص ۱۱۴

۳۴۔ انجانے اتھاس کی کڑیاں، افسانوی مجموعہ، بے ثمر سچ، نور شاہ، ناشر امیکس بکس این۔ آئے۔ ٹی

روڈ حضرت بل سرینگر، ص ۵۸

۳۵۔ افسانہ،صلیب، ایضاً،ص ۷۵

۳۶۔ افسانہ،اندھیرے اُجالے، ایضاً،ص ۷۸

۳۷۔ ایضاً،ص ۸۰

۳۸۔ افسانہ، بے معنی سفر، ایضاً،ص ۹۰

۳۹۔ افسانہ، بے جڑ پودے، ایضاً،ص ۹۸

۴۰۔ افسانہ، رات کا سورج، ایضاً،ص ۱۳۶

۴۱۔ افسانہ،گھر بے گھر، ایضاً،ص ۱۴۷

۴۲۔ افسانہ،اس کی گلی کا پاپ، ایضاً،ص ۱۶۴

۴۳۔ افسانہ، میرے خوف کی کہانی، ایضاً،ص ۱۹۶

حاصل مطالعہ

جموں و کشمیر شروع سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس سرزمین نے کئی نامور عالموں ،شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے۔جموں و کشمیر کے قلم کاروں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔نورشاہ کا شمار جموں و کشمیر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی ولادت ۹/جولائی ۱۹۳۶ء میں سری نگر میں ہوئی۔ان کے والد کا نام غلام نبی شاہ تھا۔ابتدائی تعلیم سرینگر ہی سے حاصل کی۔نورشاہ کے والدین بھی تعلیم یافتہ تھے۔اس لئے انہوں نے نورشاہ کی تعلیم و تربیت کے لئے عمدہ فرائض انجام دیئے۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد امر سنگھ کالج سرینگر سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔کم عمری میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔نورشاہ چونکہ تمام بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔اس لئے انہیں گھر میں بڑے بھائی کے فرائض انجام دینے پڑے۔انہوں نے بھائی بہنوں کے اخراجات پورے کرنے نیز ان کی تعلیم و تربیت کرنے میں میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔نورشاہ کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔وہ ڈپٹی کمشنر سینٹرل محکمہ دیہی ترقی، فلیڈ پبلک سیتی آفیسر جموں کشمیر، ڈائریکٹر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ڈیپارٹمنٹ، چیف اگزیکیٹو آفیسر جموں کشمیر اور انرجی ڈولپمنٹ اجنسی جموں کشمیر جیسے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۹۴ء میں ملازمت سے سُبکدوش ہوئے۔

نورشاہ کو بچپن ہی سے اردو ادب سے لگاؤ تھا۔ان کا ادبی سفر تقریباً ۶۰ سال کے عرصے پر محیط ہے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار اور خاکہ نگار بھی ہیں۔لیکن ادب میں جس صنف نے انہیں اعلیٰ مقام عطا کیا وہ اردو افسانہ ہے۔انہوں نے ’’گلاب اور پھول‘‘ کے نام سے افسانہ لکھ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ (۱۹۶۰ء) میں ’’بے گھاٹ کی ناؤ‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا۔نورشاہ کے اب تک گیارہ افسانوی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا میں متعارف ہو چکے

ہیں۔جن میں ''بے گھاٹ کی ناؤ''(۱۹۶۰ء) ،''ویرانے کے پھول''(۱۹۶۲ء)،''ایک رات کی ملکہ''(۱۹۶۴ء)،''من کا آنگن اداس اداس''(۱۹۶۵ء)،'' گیلے پتھروں کی مہک''(۱۹۸۴ء)،''بے ثمر شجر''(۲۰۰۵ء)،''آسمان پھول اور لہو''،(۲۰۰۹ء)،''کشمیر کہانی''(۲۰۱۲ء)،''کیسا ہے یہ جنون''(۲۰۱۵ء)، ''ایک معمولی آدمی''(۲۰۱۸ء)، اور ''لفظ لفظ داستان ''(۲۰۲۰ ء) شامل ہیں۔افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تخلیقات میں ناول، ڈرامے، ناولٹ، ریڈیو ڈرامے، خاکے اور بچوں کے لئے کہانیاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔

تہذیب وثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو اپنے بطن میں بڑی وسعت رکھتی ہے۔کشمیری تہذیب کو بھی دیگر تہذیبوں سے انفرادیت حاصل ہے۔کلچر انسانی فکر ونظر اور میلانات ورجحانات کا ایک نہ ختم ہونے والا ہمہ جہت اور ہمہ گیر نظام ہے۔یہ سماج کی نہج پر مقرر شدہ عادات واطوار کا ایک ایسا نظام ہے جو تاریخی طور پر اخذ شدہ میلانات ورجحانات ،تعمیرات کے اجتماعی نظام سے متعلق ہے۔خطۂ کشمیر تہذیبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔مورخین کے مطابق یہ بتایا گیا ہے کہ سکندر اعظم نے جب ہندوستان اور چین پر حملہ کیا تھا وہ اس وقت کشمیر کے راستے سے ہی ہو کر گزرا تھا۔قدیم زمانے میں یہ علاقہ وسطی ایشیاء کو برصغیر سے جوڑنے میں مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔اسی کی بناہ پر یہاں مختلف زمانوں میں مختلف النسل اقوام اور قبائل کے لوگ وارد ہوتے رہے۔ان میں بہت سارے لوگ یہاں آباد بھی ہوئے۔ان لوگوں کا تعلق الگ الگ مذہب ،فرقے اور عقیدوں سے تھا۔ان لوگوں میں آریہ،نورانی اور سامی وغیرہ تھے۔اسی طرح اس ریاست میں ایک ملی جلی تہذیب وثقافت پروان چڑھی۔مختلف نظریات ،عقائد،نظام حکومت ، رسومات ،قوانین، ضابطے،فنون لطیفہ، مذہب آرٹ اور زبان و ادب، کسی بھی تہذیب و ثقافت کا مجموعی خاکہ مرتب کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور انسانی معاشروں میں تہذیب وثقافت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔انسانی سماج تہذیب وثقافت کے بغیر ارتقائی منازل طے کر ہی نہیں سکتا۔درحقیقت انسانی معاشرے میں تہذیب و

ثقافت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔انسان کا رہن سہن، لباس، اٹھنا بیٹھانا، کھانا پینا، عادات و اطوار اور نظریات وعقائد تہذیب کی خاص پہچان ہوتے ہیں۔

تہذیب سے متعلق بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ یہ انسان کے اجتماعی رویوں اور آداب و اطوار میں پائی جانے والی اچھائیوں کا نام ہے۔کچھ لوگوں کے نزدیک ''تہذیب'' سچائی پاکیزگی اور نیکوکاری جیسی اقدار کا نام ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ تہذیب چند ایک عبقری شخصیتوں کی ذاتی اور تخلیقی قوتوں کا ظاہری روپ ہے۔ ہر علاقے کا اپنا سماج ہوتا ہے اور مخصوص قسم کے رسوم اور اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔رسم و رواج تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے ذریعے معاشرے میں ہونے والے صدیوں کے تجربات ومشاہدات اور طریقوں پر روشنی پڑتی ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے۔

کشمیر کی مشترکہ تہذیب میں قبر پرستی، چڑھاوے چڑھانا، تعویز گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور منتیں مانگنے کا رواج یہاں کی تہذیب میں رچا بسا ہوا ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کشمیر میں زیادہ تر جو تہذیب رچی بسی ہوئی ہے اُس میں صوفیاء حضرات کا بہت ہی اہم کردار رہا ہے۔اُنہوں نے ہی کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور وہاں کی فنکاری کو ترویج بخشی ہے۔اُن میں سب سے اہم نام حضرت سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جنہوں نے کشمیر کی ثقافت وتہذیب کو پروان چڑھانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔اُنہوں نے کشمیر کی تہذیب وثقافت پر گہرے مذہبی، معاشی اور اقتصادی اثرات چھوڑے جن سے خاص کر وادی کشمیر آج بھی فیض یاب ہے۔آپ نے فنون عامہ وثقافت اور معاشی میدانوں میں وادی کشمیر میں جو کام کیا وہ بے مثال ہے اور اس قدر علم ہنر اور فن کی ریل پیل پہلے کشمیر میں نہ تھی۔آپ کے ساتھ آنے والے ۷۰۰ افراد ہنر اور فن کے ماہر اور کاریگر تھے۔جو کشمیر میں اپنے فن کی بدولت مشہور ہوئے اور ان کے سکھائے ہوئے ہنروں میں شال بافی، قالین بافی، برتن سازی یا ظروف سازی، کپڑا بنائی اور خطاطی، خوش نویسی نے خوب ترقی کی اور یہ فنون خوب پھلا پھولا اور صنعت نے ایک نیا رُخ اپنایا۔آج بھی کشمیر کی شالیں، قالین اور گرم کپڑے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

ان صوفیا نے کشمیر میں بہت سے پیشے لوگوں کو سکھائے اور صدیوں تک ہنرمندوں اور کاریگروں کو ایک معاشی خود کفالت سے بہرہ مند کر دیا۔ ادب اگرچہ انسان کی زندگی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ لیکن یہ انسانی زندگی کا جب تک عکاس نہ بن جائے تب تک اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ انسان یہی ادب تخلیق کرتا ہے۔ انسانوں میں بھی چند کو ہی یہ ذہنیت وقابلیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ادب کو جانچ پرکھ اور پہچان سکے۔ ادیب ایک بہت ہی حساس اور دل بستا انسان ہوتا ہے۔ وہ جس طرف بھی جاتا ہے اپنی گہری سوچ وسیع النظر اور دوررس نتائج کی سوچ بھی رکھتا ہے۔ وہ جس ماحول میں رہتا ہے۔ جہاں پلتا بڑھتا ہے وہاں کے ماحول، تہذیب، سماج، رسم و رواج سب کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو گہرائی سے پرکھتا بھی ہے۔ سماج میں پنپنے، بڑھنے اور رواج پانے کے تمام عوامل کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے۔

نور شاہ نے بھی اپنے افسانوں میں یہ تمام تر باتیں پیش کی ہیں۔ اپنے افسانوں میں انھیں جہاں کہیں موقع ملا کشمیری تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے کشمیری تہذیب، ثقافت اور رسم و رواج کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ نور شاہ نے کشمیر کے سایہ دار درخت چنار کا ذکر بھی جابجا اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ لذیز میوے یہاں کے سیب، اخروٹ، بادام، خوبانی، زعفران اور آلو بخارا کا بھی ذکر اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری رسومات اور ان کے ادا کرنے کے طریقوں کا ذکر بھی اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ کشمیر کی ٹھنڈی ہواؤں، خوش گوار موسم، برف سے بھری بڑی بڑی چوٹیاں، خاموش جھیلوں، پراسرار نظاروں اور چشموں وغیرہ کا ذکر منظر نگاری کے حوالے سے اپنے افسانوں میں کثرت سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نور شاہ کے افسانوں میں نمایاں طور پر کشمیری کلچر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں اُنہوں نے کشمیری رہن سہن، رسومات اور غربت وغیرہ کو پیش کیا ہے وہیں کشمیر کے خوب صورت مناظر بھی ان کے افسانوں میں جابجا ملتے ہیں۔ چاہے موسم بہار کے حسین نظارے ہوں یا موسم سرما کی شدت بھری سردی یا پھر برف سے ڈھکے پہاڑوں کے ٹیلے، ان سب

کی منظر کشی ان کے یہاں ملتی ہے۔

مختصر یہ کہ نورشاہ کے افسانوں میں کشمیر کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ کشمیر کے عصری مسائل بھی بیک وقت نظر آتے ہیں۔ادب سماج کا آئینہ ہے اور تخلیق کار وہی لکھتا ہے جو وہ اپنے گردو پیش میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔نورشاہ نے بھی اپنے افسانوں میں وہی مسائل پیش کیے ہیں جو اُن کے گرد وپیش رُونما ہوئے ہیں۔

وادی کشمیر جہاں اپنے فطری حسن، جاذب نظر مناظر، سحر انگیز کہساروں اور نشیب و فراز آبشاروں کی بدولت پوری دنیا میں بہشت عارضی کا درجہ رکھتی ہے۔ وہیں یہ اپنی تہذیب وثقافت میں بھی اعلیٰ اور منفرد مقام کی حامل ہے۔کسی بھی سماج کی اپنی ایک مخصوص تہذیب ہوتی ہے۔سماج کے نظریات، عقائد، نظام حکومت، رسومات، خواتین، فنون لطیفہ، مذہب، آرٹ اور زبان وادب کسی بھی تہذیب و ثقافت کا مجموعی خاکہ مرتب کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ایک قوم یا ایک ملک کا جغرافیہ الگ ہوتا ہے جس کے اثرات اس علاقے کی تہذیب وثقافت پر بھی پڑتے ہیں اور وہاں کی تہذیب وثقافت اپنی ایک الگ شناخت اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، کشمیر اپنے جغرافیائی محل وقوع، سیاسی و تاریخی، اراضی حسن اور تہذیب وثقافت کی رنگا رنگی کے سبب برعظیم میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔کشمیری تہذیب وثقافت اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔کشمیر کا خوش گوار موسم،ٹھنڈی ہواؤں کا بانکپن، برف پوش بڑی بڑی چوٹیاں، خاموش جھیلیں، پُراسرار نظارے، جھرنے اور خوبصورت چشمے اسے دنیا کے دوسرے خطوں سے انفرادیت عطا کرتے ہیں۔کشمیر کا علاقہ زیادہ ٹھنڈا ہے یہاں کے لوگ سردیوں سے بچنے کے لئے صدیوں سے کچھ طریقے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں جن کا تعلق یہاں کی مخصوص تہذیب سے ہے۔اس کے علاوہ بادشاہوں مختلف ادوار میں یہاں فن تعمرات کے اعلیٰ نمونے عطا کیے جن میں مندر، مساجد، خانقاہیں، قلعے اور محلات شامل ہیں۔جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ یہاں کے ذہین دست کاروں کی دست کاری کے انمول نمونے اپنی دست کاری کی گواہی دیتے ہیں۔کشمیر کی شال بافی،

پیپر ماشی، قالین بافی اور کشیدہ کاری عالمگیر شہرت رکھتی ہے۔ کشمیری لباس اور پکوان کی بھی منفرد شناخت ہے۔ کشمیری وازوان اور اسے پیش کرنے کا اپنا انوکھا انداز ہے۔ کشمیری لوگوں کی مہمان نوازی کے چرچے دور دور تک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیریوں کے رسومات اور ان کو ادا کرنے کی ڈھنگ بھی دیگر خطوں سے مختلف ہیں۔ شادی بیاہ اور مختلف تہواروں پر مختلف رسموں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں عقیقہ، منڈن، بات منگنی، مہندی کی رسم، فاتحہ خوانی، برات، رخصت اور نکاح خوانی وغیرہ شامل ہیں۔

ایک ادیب جس عہد اور جس سماج میں پرورش پاتا ہے ادب تخلیق کرتے وقت کسی بھی صورت میں اس سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ادب اپنے عہد کا عکاسی ہوتا ہے اور جس معاشرے میں ادب تخلیق کیا جاتا ہے اس معاشرے کی تہذیب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ ادیب جس معاشرے میں رہتا ہے اس کا رہن سہن، طرزِ زندگی، بات چیت، لباس اور رسومات وغیرہ کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے اس لئے ادب اپنے عہد کا آئینہ کہلاتا ہے۔ ادیب سماج کا ایک حساس شخص ہوتا ہے۔ وہ جس معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے غیر شعوری طور پر بھی اس معاشرے کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ نور شاہ کا تعلق چونکہ کشمیری معاشرے سے ہے ان کا جنم کشمیر میں ہوا۔ اس لئے کشمیری تہذیب ان کی رگ و پے میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک ادیب جس سماج میں پلے بڑھے اور اپنی تمام زندگی گزارے اور ادب تخلیق کرتے وقت اس سماج کی تہذیب اس کی تخلیقات کا حصّہ نہ بنیں۔ نور شاہ نے اپنی عمر کا طویل عرصہ فن افسانہ نگاری کی آبیاری میں صرف کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی خوبصورتی و رعنائی اور مختلف سماجی مسائل کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری تہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔ نور شاہ نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے رسم و رواج، کھان پان، شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں، تہواروں، وغیرہ کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں پری محل، شکاروں، کشتیوں، سیاحتی مقاموں، مقامی فصلوں وغیرہ کا ذکر بھی اکثر و بیشتر ملتا ہے۔

غرض نور شاہ کے تمام افسانوں کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر کی تہذیب و ثقافت

کوانہوں نے اپنے باطن میں جذب کیا ہے۔جس کا اظہار ان کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے۔ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کشمیری تہذیب کے امین ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں یہاں کی تہذیبی زندگی اور ثقافتی حالات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے،نور شاہ کے افسانے نئی نسل کے لئے ایک تہذیبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔جن کو پڑھنے کے بعد کشمیر کی منفرد اور نمایاں تہذیب ہمارے سامنے اجاگر ہوتی ہے۔اور ہم اس علاقے کی تہذیب و تمدن سے بلاشبہ واقفیت حاصل کرتے ہیں۔یہ نور شاہ کے افسانوں کا خاص وصف ہے۔

☆☆☆

کتابیات

بنیادی ماخذ

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
۱	نور شاہ	''بے ثمر سچ''	امیکس بکس این۔ آئی۔ٹی سرینگر	۲۰۰۵ء
۲	نور شاہ	''کہاں گئے وہ لوگ''	لل دید کالونی غوری پورہ کالونی سرینگر	۲۰۰۹ء
۳	نور شاہ	''انتخاب اردو ادب''	ڈیلائیٹ پرنٹنگ پریس دہلی	۲۰۱۱ء
۴	نور شاہ	''کیسا ہے یہ جنون''	الفجر پرنٹس سرینگر	۲۰۱۵ء
۵	نور شاہ	''جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار''	میزان پبلشر سرینگر	۲۰۱۱ء
۶	نور شاہ	''بے گھاٹ کی ناؤ''	کشمیر پبلشرز جموں (توی)	۲۰۰۳ء

ثانوی ماخذ

۱	ایم۔اے خان	''کشمیر تاریخ کے آئینے میں''	جے۔کے بک شاپ سرینگر	۲۰۰۴ء
۲	ایم۔ایس ناز	''تصویر کشمیر''	گلشن پبلشر سرینگر	۱۹۹۳ء

۳	برج پریمی	''جموں کشمیر میں اردو کی نشو ونما''	رچنا پبلی کیشر جموں	۱۹۹۲ء
۴	برج پریمی	''کشمیر کے مضامین''	تپسیا آزاد بستی نٹی پورہ	۱۹۸۹ء
۵	حامدی کاشمیری	''ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب''	گلشن پبلیکیشن گاؤ کدل سرینگر	۱۹۹۱ء
۶	دیپک بدکی	''چنار کے پنجے''	روہیلہ خان دریا گنج، نئی دہلی	۲۰۰۵ء
۷	دیپک بدکی	''جڑوں کی تلاش''	میزان پبلشر سرینگر	۲۰۱۹ء
۸	دیپک بدکی	''روح کا کرب''	میزان پبلشر سرینگر	۲۰۱۵ء
۹	دیپک کنول	''لال پل کا دیوانہ''	جوہر فلمز ممبئی	۲۰۱۴ء
۱۰	دیپک کنول	''پمپوش''	راہی کتاب گھر سی۔۲۰ شاہدرہ دہلی	۲۰۱۱ء
۱۱	سلیم سالک (مرتب)	''عمر مجید کے بہترین افسانے''	میزان پبلشر سرینگر	۲۰۰۹ء
۱۲	شمس الدین احمد	''راج ترنگی ترجمہ و تحقیق''	گلشن پبلشر سرینگر	۲۰۰۷ء
۱۳	فاروق احمد وانی	''شجر شمردار (نورشاہ)''	براڈ پرنٹر کرٹلہ پنجاب	۲۰۱۰ء
۱۴	محمد اقبال لون (مرتب)	''فکر و فکشن (نورشاہ)''	میزان پبلشر سرینگر دہلی	۲۰۱۷ء

رہبر ایجوکیشنل، کلچرل اینڈ ویلفئیر سوسائٹی، اورنگ آباد

زیر انصرام

سر سید کالج آف آرٹس کامرس اینڈ سائنس

(اینڈ پوسٹ گریجویشن سینٹر)

روشن گیٹ، اورنگ آباد، مہاراشٹر، انڈیا

وابستہ: ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر، انڈیا ۴۳۱۰۰۴

SIR SAYYED COLLEGE OF ARTS, COMMERCE & SCIENCE
ESTD 1990
AURANGABAD

sirsayyedcollege@rediffmail.com

ایک روزہ علمی سیمینار

بتاریخ ۱۸/ جنوری ۲۰۲۱ء

بعنوان دورِ حاضر میں اُردو تدریس
اہمیت، مسائل و عصری تقاضے

On URDU PEDAGOGY IN MODERN ERA
Importance,Issues and Requirements

Certificate

Q7BXO0-CE000070

This is to Certify that Dr./Mr./Miss **GHULAM MURTAZA**

Proff. / Asso. Proff. /Asst. Proff. of **UNIVERISTY OF HYDERABAD**

Has Participated • In Urdu Pedagogy in Modern Era -Impotence, Issues & Requirements.

Chief Patron	Principal /Patron	Convener	Co-Convener
Dr. Shamama Parveen	Dr. Shaikh Kabeer Ahmed	Dr. Mohammed Mustafa Khairi	Dr. Siddiqui Saimuddin
Chairperson, Rehbar Educational,Cultural & Welfare Society, Aurangabad, India.	Principal, Sir Sayyed College of Arts,Commerce & Science,Aurangabad.India.	H.O.D Dept.Of Arabic Sir Sayyed College of Arts,Commerce & Science,Aurangabad,India.	Assistant Professor Dept.Of Urdu Sir Sayyed College of Arts,Commerce & Science,Aurangabad,India.

Made for free with Certify'em

DECLARATION

I **GHULAM MURTAZA** hereby declare that this dissertation entitled "NOOR SHAH KE AFSANOUN MEIN KASHMIRI TEHZEEB KI AKKASI" "submitted by me under the guidance and supervision of Dr. ARSHIA JABEEN Is a bonafide research work which is also free from plagiarisms. I also declare that it has not been submitted previously part-time or full-time to this university or any other institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shoudhganga/INFLIPNET.

Date

Signature of Supervisor
Dr. Arshia Jabeen

Signature of Student
Name: Ghulam Murtaza
Reg. No: 20HUHL02

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation Entitled "NOOR SHAH KE AFSANOUN MEIN KASHMIRI TEHZEEB KI AKKASI" Submitted by GHULAM MURTAZA Bearing Registration No 20HUHL02 in partial fulfillment of the requirement for the award of Degree of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out him under my Supervision and Guidance.

The said Dissertation has not been submitted previously in part-time or full-time to this or other universities/Institutions for the award of any degree or diploma.

Signature of Supervisor

Counter Signature

Head of the Department

Dean
School of Humanities

NOOR SHAH KE AFSANOUN MEIN KASHMIRI TEHZEEB KI AKKASI

A Dissertation Submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfilment of the Requirements for the Award of

MASTER OF PHILOSOPHY

IN

URDU

By

GHULAM MURTAZA

Enrolment No. 20HUHL02

Supervisor

DR. ARSHIA JABEEN

Professor, Deptt. of Urdu

University of Hyderabad

DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES

University of Hyderabad, Gachibowli, Hyderabad, Telangana-500046

2022

NOOR SHAH KE AFSANOUN MEIN KASHMIRI TEHZEEB KI AKKASI

A Dissertation Submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfilment of the Requirements for the Award of

MASTER OF PHILOSOPHY

IN

URDU

By

GHULAM MURTAZA

Enrolment No. 20HUHL02

Supervisor

DR. ARSHIA JABEEN

Professor, Deptt. of Urdu

University of Hyderabad

DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES

University of Hyderabad, Gachibowli, Hyderabad, Telangana-500046

2022